عرش صہبائی

(شخصیت اور شاعری)

مُصنف

پروفیسر ایس. اے. قاضی. شآد شرقی

سابق صدر شعبہ ارضیات اور ڈین سٹوڈنٹس ویلفیئر

پوسٹ گریجویٹ کالج بھدرواہ (جموں وکشمیر)

شرقی پبلی کیشنز، پاری [illegible] بھدرواہ (جانڈرکی) انڈیا

عرشؔ صہبائی

شخصیت اور شاعری

مصنّف

پروفیسر ایس، اے، قاضی ۔ شاؔذ شرقی

ایم، اے۔ جغرافیہ ایم، اے۔ اُردو، بی ایڈ (علیگ)

ڈی، بی، ایم، ایس (کلکتہ)

سابق صدر شعبہء اَرضیات اَور ڈِین سٹوڈنٹس ویلفیر

پوسٹ گریجویٹ کالج بھدرواہ (جموں کشمیر)

شرقی پبلیکیشنز پاسری بس اسٹینڈ بھدرواہ (جے اینڈ کے) انڈیا

کتاب کا نام:۔ عرشؔ صہبائی۔ ذات وصفات

مصنّف:۔ پروفیسر شبیر احمد قاضی شآذ شرقی

ترتیب وانتخاب:۔ نازؔ نظامی

سرورق:۔ عاطف عندلیب قاضی، ابو عامر قاضی

زیرِ اہتمام:۔ شرقی پبلیکیشنز پاسری، بس اسٹینڈ بھدرواہ

کمپوزنگ اینڈ گرافکس:۔ شان کمپوزرس عمر آباد (کاہی) بھدرواہ۔

Mob:9906356750, Land line:01997245002

سنِ اشاعت:۔ ۲۰۰۸ء

تعداد:۔ ۵۰۰

قیمت:۔ ۲۵۰

طباعت:۔ انیس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

ناشر:۔ پروفیسر نوید شبیر قاضی ، ایم۔ایس۔سی۔ جغرافیہ

تقسیم کار:۔

۱۔ پروفیسر ایس۔اے۔ قاضی (شآذ شرقی) پاسری بس اسٹینڈ بھدرواہ۔۔ موبائیل۔۹۴۱۹۱۵۵۱۱۶

۲۔ ڈائمنڈ بک ہاوس۔۔۔ گوجر نگر۔۔ جموں

۳۔ مغل اسٹیشنری۔ اولڈ بس اسٹینڈ۔ بھدرواہ

۴۔ فاروق بک ہاوس۔ صدر بازار۔ بھدرواہ۔

۵۔ گونی بک ہاوس، محلہ مسجد بھدرواہ

۶۔ عرشؔ صہبائی۔۵۳ ریشم گھر کالونی جموں ۱۸۰۰۱۶

۷۔ رساؔ جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جی ۶ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کینال روڈ جموں

اِنتساب

اعجاز احمد اعجازؔ

ثبط

نشاطؔ کشتواڑی

کے نام

(شائد نہ مل سکے کہیں تجھ سا سُخن شناس)

پروفیسر شاذؔ شرقی

مشمولات

یہ تنقیدی کاوش

ڈاکٹر شباب للت

برصغیرِ ہند کے مقبول و معروف شاعر اور دانش ور عرش صہبائی کے شاگردِ رشید پروفیسر ایس۔ اے قاضی (شاذ شرقی) جو زیرِ نظر کتاب کے مصنّف ہیں، تعلیم و تدریس کے فنِ شریف سے وابستہ ہیں۔ آپ اپنے پیشے اور وسیلۂ روزگار کے تقدّس شناس ہیں۔ اپنے دورِ شباب میں ایسے معتبر معلّم کے ذہن میں شاعری کے تخم کی بالیدگی ایک فطری عمل اور تقاضائے طبع تھی کیونکہ شاعری ان کی آبائی میراث تھی جو اُن کے والدِ محترم جناب اسعد بھدرواہی کی جانب سے اِنہیں ودیعت ہوئی تھی۔ لیکن شاعری کے لئے اُن کی موزونیٔ طبع مشاطگی کی منتظر تھی اور یہ کمی عرش صہبائی جیسے کامل رہبر نے پوری کردی جس نے شاذ کے آئینۂ ہُنر کو صیقل کر کے اُسے فنکارانہ خوداعتمادی کا جوہر عطا کردیا۔ اپنے رہبر کے تئیں نیازمندی اور سعادت مندی کا اظہار شاذ کی یہ تنقیدی کاوش ہے جو "عرش صہبائی شاعری اور شخصیت" کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ اِس بصیرت افروز کتاب میں شاذ نے اپنے اُستاد عرش صہبائی کے حسب نسب، حالات و واقعاتِ زندگی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کو عرش کی بیش بہا دین کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ بھی پیش

کرنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔

عرش صاحب سے پروفیسر شاذ شرقی کی پہلی مُلاقات جمّوں میں اُنکے ایک دوست اور بہی خواہ جناب شہاب عنایت ملک کے توسط سے ہوئی جب شاذ اپنے شفیق والد اسعد بھدرواہی مرحوم کی بیاضِ سخن کو شائع کرنے سے قبل اُس پر کسی کاملِ فن سخن گو سے نظرِ ثانی کروانے کے متمنی تھے۔ تب عرش نے اُنکی دستگیری کی۔ اِس واقعے کا ذکر ''چند حقائق'' کے زیرِ عنواں اپنی طویل عرضِ مصنف میں خود شاذ نے کیا ہے۔ تب سے وہ عرش کے حُسنِ کردار کے گرویدہ ہو گئے اور اُن کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمّذ تہ کر کے شاذ نے اُن کا دستِ شفقت تھام کر خود کو خوش مقدّر سمجھا۔

شاذ نے اپنی اِس اہم تصنیف میں عرش صاحب کے سوانحِ حیات کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصّیت، اُن کے وسائلِ روزگار، سرکاری مُلازمت میں اُن کی فرض شناسی، اُن کی خاندانی روایات، زندگی کے واقعات وتجربات، کردار وعمل، نیز عرش کی شاعری پر اِن عوامل کے مُرتّب کردہ اثرات کا بھرپُور مطالعہ نذرِ قارئین کیا ہے۔ اِسی کے ساتھ عرش کی عادات واطوار چھوٹوں اور بڑوں سے برتاؤ، رشتوں کی پاسداری، سلیقۂ گفتگو، ہم عصر قلم کاروں سے ان کے حُسنِ سلوک، مُروت، اخوّت، وضعداری، وسیع النظری

اور علوِ اخلاق کو مختلف واقعات کے تناظر میں اُجاگر کیا ہے۔ یادوں کی یہ اِندر دھنشی پرچھائیاں کِتابی صورت میں ایک حسین یادگار بن گئی ہیں۔ اگلے ابواب میں عرشؔ کے تخلیقی سرمایہ کا حتی الامکان غیر جانبداری سے مُحاکمہ کیا گیا ہے۔

عرشؔ صہبائی اپنی ذات میں اِک انجمن ہیں، عرشؔ وہ فنکار ہے جس کے فن کا سرچشمہ ہمیشہ اُبلتا رہتا ہے، کبھی رُکتا نہیں، رواں دواں ہے۔ شاعری اُسکی روح کی غذا ہے جس کی عطا کردہ توانائی اُسے خاموش بیٹھنے نہیں دیتی۔ اُس کی تخلیقیت ایک شانِ استغنا کے ساتھ جاری و ساری ہے، فعّال وسرگرم ہے۔ اُردو زبان واَدب کی بھرپُور اور مثبت خدمت وہ عمر کی اِس تیکھی ڈھلان پر بھی پوری مستعدی سے کر رہا ہے۔

عرشؔ نہ ترقّی پسند ہے نہ جدید یہ۔ اُس نے اَدب میں کِسی اِزم Ism کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اِن تحریکوں اور مکاتبِ فکر کی بحث و تکرار سے بے نیاز وہ اپنی تخلیق کی دُنیا میں مست مگن ہے۔ وہ جان نثارِ غزل ہے بلکہ فنافی الشعر۔ اسے نہ جدیدیت سے وابستگی ہے نہ مابعد جدیدیت سے سروکار۔ اسلوب میں روایت کا پاسدار رہتے ہوئے اُس نے جدید لب ولہجہ نئے علائم، تازہ تلازمات اور نئے موضوعات کے تنوع سے اپنی شاعری کی

تزئین و آرائش کی ہے اور جدید فکری دائروں میں نَو بہ نَو تجربات اور وقت کے تقاضوں کو تازہ کاری کے ساتھ شعری پیکروں میں ڈھالا ہے، اور اِن تجربات ورُجحانات کے بیان اور اظہار میں شائستگی ہے، روانی ہے، زبان کی پاکیزگی، جذب اور امیج Image کی ہم آہنگی ہے۔

عرشؔ صہبائی کی شاعری محض رودادِ محبّت اور قصۂ ہجر و وصال نہیں بلکہ اِس کے متنوع موضوعات و مضامین شاعر کے دَورِ حیات کا آئینہ ہیں۔ حالاتِ گرد و پیش کی دھوپ چھاؤں میں آج کا اِنسان کیسے زندگی کر رہا ہے۔ وقت کے نئے تقاضوں، نئے مسائل و مُشکلات کے ساتھ وہ کیسے جُوجھ رہا ہے۔ عرشؔ کی نظمیں ہوں یا غزلیں، دوہے ہوں یا قطعات، یہ سبھی انسان کی قلبی واردات وحکایات کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کی نفسیاتی دستاویزیں ہیں جن میں تصوّف وفلسفہ کی روحانی رموز کُشائی سے لے کر شاعر کے ذاتی کرب ونشاط، سماج کے اجتماعی شعور، عصری مسائل، وقت کے نازل کردہ خوف و دہشت، عدم تحفّظ اور زخم زخم زندگی کے نوحے ہیں۔ وہ زندگی جو اپنا حُسن، جذب و کشش کھو چکی ہے، جس میں اِنسان حالات کے ہاتھوں کی کٹھ پُتلی بن کر رہ گیا ہے۔ بے ضمیر سیاست اپنی حیوانی کھیل کھیل رہی ہے۔ جہاں خود غرض سیاست دان، مذہب اور ذات پات کے ٹھیکے دار نت نئے

دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ مکروہ سیاست کے اندر کی کثافت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کھڑکیوں پر نت نئے رنگین اور پُر فریب پردے سجائے جاتے ہیں اور عوام کو بھول بھلیّاں میں اُلجھا کر اُن کی لُوٹ اور حق تلفی جاری ہے۔ وہ زندگی جو بے انصافیوں، بے اعتدالیوں، نابرابری، دھاندلی، جرائم پیشہ سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور بے رحمیوں کا شکار ہے، جس میں رشتوں کا مصنوی پن شاعر کے دِل کو کچوٹتا ہے، جس میں دوستی اور دُشمنی کے معیار بدل چکے ہیں۔ مرزا غالبؔ نے غزل کے بارے میں فرمایا تھا

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بے کراں کے لئے

غزل کے موضوعاتی آفاق ہر چند کہ بے حد وسیع اور بے کنارہ ہیں، لیکن اِس کا حُسن کلاسکیت کے غازے کے بغیر نہیں نکھرتا۔ کلاسکیت اب بھی غزل پر غالب ہے اور سدا رہے گی۔ ہر فنکار اپنی جگہ ایک "محشرِ خیال" ہے۔ اسکی غزل میں جذبہ ہے، دروں بینی ہے، زندگی کے متنوع تصورات ہیں، نگاہ کی آوارگی بھی ہے اور ذہن ونظر کا ارتکاز بھی، مُشاہدہ بھی ہے، شدّتِ احساس بھی، داخلی اور خارجی دُنیا کی سیر بھی، حسی تجربات و واردات کا اظہار و انکشاف بھی۔ لیکن صنفِ غزل میں ان کا بیان اور پیکر تراشی ایک موسیقیت، لے، روانی، آہنگ، ترنّم، ترتیب، توازن اور عروضی آگہی کی محتاج ہے۔ غزل

کا اپنا ایک ڈِسپلن ہے۔ اس کی اپنی جمالیات ہے، اشاریے اور علائم کا ایک حسین، شائستہ اور باسلیقہ نظام بھی، جسے عرشؔ صہبائی نے بڑی کامیابی اُور پابندی کے ساتھ اپنایا اور نبھایا ہے۔ وہ نہ آزاد و بے محار غزل کا قائل ہے نہ ہی نثری نظم کا۔ غزل کا یہ منضبط نظام اُس کی شاعری کو quotabe بناتا ہے اور اُس کے طلسم و تاثر کو جاودانیت عطا کرتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ موضوعاتی سطح پر غزل خواہ جدیدیت کے جتنے بھی زینے طے کرے، کلاسیکیت سے دامن نہیں چھڑا سکتی۔ کلاسیکیت اب بھی غزل پر غالب ہے اور سدا رہے گی۔ کلاسیکیت اس کے حُسن کو دوبالا کرتی ہے۔ اس کی جمالیات کی صہبائے ناب کو دو آتشہ بناتی ہے۔ عرشؔ صہبائی کی شاعری کو ہم کلاسیکل لہجے کی ترقّی پسندی کا نام دے سکتے ہیں یا کلاسیکی آہنگ کی جدیدیت کا۔ شاذؔ نے اس کی شاعری میں اِن فسوں ساز عناصر کی کھوج کی ہے۔

میدانِ شاعری میں عرشؔ کے پیش رو بزرگوں اور اکابرینِ ادب نے وقتاً فوقتاً عرشؔ کی ادبی کاوشوں کے بارے میں جو اِظہارِ خیال کیا ہے، نیز عرشؔ کے ہم عصر شعراُ و اُدباً کے دِلوں میں موصوف کے لئے جو احترام، محبّت اور عقیدت ہے نیز اُسکی تخلیقی دین کی جو وقعت و منزلت ہے،

اُس سے منسوب آراُ کے لئے شاذؔ نے اپنی اِس تصنیف کا ایک خصوصی باب وقف کیا ہے۔

مصنّف نے عرشؔ صہبائی کے ابھی تک کے مطبوعہ شعری مجموعوں اور نثری تصانیف کے حوالوں سے موصوف کی تخلیقی توانائی، فکری انفرادیت، مشاہدے کی آنچ، اظہار کی بے باکی، حقیقت نگاری اور عوامی مقبولیت کو جو اسناد عطا کیا ہے اِس بالا ستیعاب تنقیدی عمل میں کہیں کہیں تنقید سے زیادہ عقیدت مندی کی رمق جھلکتی ہے جو ایک سعادت مند اور نیاز کیش کے رویّے میں ایک متوقع جواز کی حامل ہے جو مقامِ بحث و گفتگو نہیں ہوتا۔

اِس میں شک نہیں کہ عرشؔ صہبائی کے بعض اشعار ضرب المثل کی طرح مقبولِ خواص و عوام ہوئے ہیں۔ چونکہ اِس کتاب کے خالق نے اپنی طویل عرضِ مصنّف میں، نیز عرشؔ کی شاعری کی توزین و تصریح کے باب میں اُن کے اشعار کے کثیر حوالے دئے ہیں، لہٰذا یہاں مزید اشعار کے نمونے غیر ضروری تکثیر کے مترادف ہونگے۔ میں اُن کے دو تین اشعار پیش کرنے پر ہی اکتفا کروں گا جو مجھے خاص طور پر پسند ہیں، مثلاً

وقت کی سب ستم ظریفی ہے
ورنہ انساں بُرا نہیں ہوتا

ورنہ انساں برا نہیں ہوتا

عرشؔ اُن کی جھیل سی آنکھوں کا اِس میں کیا قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

نور و نکہت کی کوئی موجِ رواں گزری ہے
وہ اُچٹتی سی نظر رنگ فشاں گزری ہے

عرشؔ حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت اور خوش گوئی کے جوہر سے مالامال ہیں۔ اپنے نجّی اور قریبی احباب، یعنی "منجملۂ خاصانِ خاصانہ" کی صحبت میں عرشؔ مجسّم پھلجھڑی بن جاتے ہیں جو روشنی کے ساتھ طرح طرح کے رنگ بکھیرتی ہے۔ ایسی محفلوں میں عرشؔ کی چہلیں، بذلہ سنجی، خوش طبعی، لطیفہ گوئی، جملہ طرازی اور طنز و مزاح کی حِس اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔ ان کے اِن خصائل پر بھی نظر ڈالنا ضروری تھا جو اِن کی شخصیت کا ایک اہم اَور خصوصی پہلو ہے۔ بقول میتھیو آرنلڈ "اگر فن کو زندگی کی تنقید مان لیا جائے تو اِسکی بہترین مثال طنز و ظرافت کے نمونے ہوں گے"۔ ان کی غزلوں کے کُچھ اشعار میں طنز کی کاٹ ملاحظہ ہو:۔

دُور کر دے گا زمانے سے مُجھے میرا خلوص
مُجھ کو اپنی اِس صلاحیت کا اندازہ نہ تھا

مجھے کعبہ و دیر سے لے چلو

بڑا شور اِن کارخانوں میں ہے

''صلاحیت'' اور ''کارخانوں'' جیسے الفاظ کی نشتریت محسوس کیجئے۔ ایک اور شعر ایسا ہی

یہ چاہتا ہے کہ اِس دور پر کروں تنقید

وہ شخص قبر میں زندہ اُتارتا ہے مجھے

اِس تصنیف میں شاذ شرقی نے عرش صہبائی کی شخصیت، نیز اُن کے تخلیقی آفاق و ابعاد پر روشنی ڈال کر اُن کے ادبی سرمایہ کا حسبِ استعداد ایک بصیرت افروز اور غیر جانبدارانہ، معروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ ادبی دستاویز عرش شناسی کے عمل میں مستقبل کے تشنگانِ ادب اور تحقیق کاروں کیلئے یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

نیو شملہ

۲۲ مارچ ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر شباب للت

سابق ایڈیٹر سہ ماہی ''جدید فکر و فن''

ہماچل پردیش سرکار۔ شملہ۔ ۹

پیش لفظ

وادیٔ بھدرواہ جسے کشمیرِ صغیر بھی کہا جاتا ہے، کسی تعارف کی محتاج نہیں، اِس مُردم خیز زمین نے کئی شہرہ آفاق ہستیوں کو جنم دیا جن میں شعرأ، اُدبأ اور محققین شامل ہیں۔ ان روشن ستاروں میں پروفیسر شاؔذ شرقی بھی ایک معتبر نام ہے۔ ادب سے خُوب ذوق رکھتے ہیں۔ ایک بہت اچھے شاعر ہونے کے علاوہ آپ ذی قدر معلّم اَرضیات، مصنّف، طنز نگار، افسانہ نویس اور ایک بہترین مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کِتنے فنون کے ماہر ہیں، اَرضیات (جغرافیہ) میں ایک درجن سے زیادہ کِتابوں کے مصنّف ہیں جن میں کئی بی۔اے اور ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہیں، اَرضیات سے تعلّق رکھنے کے باوجود شاؔذ شرقی نے اپنی خاندانی ادبی روایت کا دامن نہیں چھوڑا، اُن کا شعری مجموعہ ''صدائے دِل'' پہلے ہی ادبی حلقوں سے داد وتحسین حاصل کرچکا ہے، عرشؔ صہبائی شرؔقی صاحب کے اُستاد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کتابِ ہذا لکھ کر اُنھوں نے نہ صرف اپنا نام ادبی حلقوں میں روشن کیا بلکہ عرشؔ کی شاگردی کا پورا پورا حق بھی ادا کردیا ہے۔

عرشؔ صہبائی کا نام شعروادب کی دُنیا میں، کسی تعارف کا مُحتاج نہیں ہے، ان کا شمار نہ صرف مُلکی سطح کے شعرأ میں ہوتا ہے بلکہ اپنی شعری اور نثری تخلیقات کی وجہ سے عرشؔ صہبائی برِصغیرِ ہندوپاک میں ایک معتبر شخصیت ہیں۔ اُن

کے ایک درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ نثر میں بھی اِن کے ادبی اور تخلیقی مضامین باضابطہ کتابوں کے علاوہ مُلک کے مختلف جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اِن کے بعض شعری مجموعوں پر مختلف طلباؑ نے ایم۔فل کے مقالات لکھ کر جمّوں یونی ورسٹی سے ایم۔فل کی سنَد بھی حاصل کی ہے۔ بعض مقالہ نگاروں نے عرشؔ کے فن پر مختلف مضامین لکھ کر ان کی شاعری اور شخصیت کو ابھارا ہے۔ ریاست کے ادبی حلقوں میں شدت سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ عرشؔ صہبائی کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور جامع مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو، تا کہ ان کی زندگی کے مختلف گوشے اجاگر ہوں اور ان کی ادبی خدمات شائقینِ ادب پر پوری طرح واضح اور روشن ہو جائیں، چنانچہ اِس کمّی کو پروفیسر شاذؔ شرقی نے پورا کر کے نئی نسل کے ادیبوں، سخنوروں اور طلباؑ کے لئے مشعلِ راہ کا کام کیا ہے۔

مصنّف نے ''عرشؔ صہبائی۔ شخصیت اور شاعری'' کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل میں اُنہوں نے تحقیقی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عرشؔ صہبائی کی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے مثلاً بچپن، آباواجداد، آغازِ تعلیم، آغازِ شاعری، ازدواجی زندگی، اولاد، مُلازمت وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باب یقیناً اُن طلباؑ کے لئے بہت مفید ہے اور مشعل راہ کا کام کرے گا جو عرشؔ پر ادبی کام کرنا چاہتے ہوں۔

عرشؔ صہبائی کے فن پر مختلف ناقدین نے وقتاً فوقتاً جو آرا پیش کی ہیں ان کو مصنف نے بابِ دوم میں جگہ دی ہے۔ ان آرا کو شامل کر کے شاذؔ شرقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ عرشؔ شاعری کے رموز و نکات سے پوری طرح واقف ہیں۔ اُن کی شاعری میں الفاظ کی سادگی، سلاست، رمز و ایما کے نِکات، چھوٹی اور پُر لُطف بحروں کا استعمال خوب سے خوب تر مِلتا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ باب کِتاب میں شامل کر کے مصنّف نے کتاب کی اہمیت کو دوبالا کیا ہے۔

باب سوم عرشؔ کی شاعری پر مشتمل ہے، شاذؔ شرقیؔ ان کے تمام شعری مجموعوں کا مطالعہ کر کے اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عرشؔ کے یہاں جہاں عشق و عاشقی کے مضامین ملتے ہیں وہیں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ حکیمانہ نظریات اور ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ روایتی ہونے کے باوجود شاذؔ نے عرشؔ کے ان اشعار کو نمونے کے طور پر اس کِتاب میں رقم کیا ہے کہ جو ریاست کی موجودہ صورتِ حال، اِنسان کا ذہنی کرب، بھوک اور مفلسی کو اپنے اندر سمٹے ہوئے ہے۔ اس سے مُصنّف نے یہ ثابت کیا ہے کہ عرشؔ کا شعری رنگ مختلف موضوعات کی عکاسی کرتا ہے، خاص طور پر چھوٹی بحور میں غزلیں لکھ کر عرشؔ اپنے لئے ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔ اور لازماً یہ شہرہ مصنّف کی پختہ کاری کے ہی سر جاتا ہے۔

کتاب کے آخری حصے یعنی باب چہارم میں مصنّف نے عرشؔ کی زندگی کے چند اہم واقعات کو قلمبند کیا ہے جو قارئین کے لئے صرف دلچسپ ہی

نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ ان واقعات سے ان کی ہمہ گیر شخصیّت تہ در تہ سامنے آتی ہے اور غربت و افلاس میں ان کی ثابت قدمی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کے تئیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض کو بھی یہ واقعات روشناس کراتے ہیں۔ مشکل سے مشکل وقت میں ان کے صبر و تحمل کا بھرپور نقشہ مصنف نے اِس باب میں کھینچا ہے اور سب سے توجہ طلب بات یہ ہے کہ مصنّف نے اس باب میں عرشؔ کے اُن عوامل کی طرف اِشارہ کیا ہے جو ان کی شاعری کا محرک بھی ہیں۔

''عرش صہبائی شخصیت اور شاعری'' کا مسودہ پڑھ کر میں بغیر ِکسی تحمّل کے کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر شاذؔ نے اُنکی شخصیت اور فن پر بعض اہم انکشافات کا اظہار کیا ہے جو اِس وقت تک قارئین حضرات کی نظروں سے اوجھل تھے، صاف اور موثّر زبان میں لکھی گئی یہ ِکتاب عرشؔ کی شاعری اور شخصیت کے اہم گوشوں پر بھرپُور روشنی ڈالتی ہے لہذا میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر شاذؔ کی یہ ِکتاب ادبی دُنیا میں ایک گراں قدر اِضافہ ہوگی اور آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

پروفیسر شہاب عنایت ملک

صدر رساؔ جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں

چند حقائق

اگر چہ میری روزی روٹی ارضیات کے مضامین پڑھانے سے جڑی ہوئی ہے، تاہم میرے خون میں گھر کے ادبی ماحول کا اثر کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں میرے والدِ مرحوم جناب اسعدؔ بھدرواہی اُردو کے بہترین اُستاد ہی نہیں بلکہ شاعری کے رموز وفن سے بھی خُوب واقف تھے۔ چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک سری امر ہائی سکول بھدرواہ میں، احقر اُن کا باضابطہ شاگرد رہا اور اُن سے اُردو پڑھی، اُس زمانے میں چونکہ تفریح کے دیگر سامان محدود ومختصر تھے لہٰذا علمی اور ادبی مجالس کا اکثر و بیشتر اہتمام ہوا کرتا تھا، لہٰذا اُن مجالس میں حاضری دینا عام لوگوں کی طرح میرا بھی محض ایک شغل تھا، کیوں کہ اس زمانے میں شعر گوئی کی طرف میرا کوئی رُجحان نہیں تھا۔

قصبہ بھدرواہ پُرانے زمانے سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اسکول کے زمانے میں، مَیں نے یہاں نہ صرف ضلعی سطح کے بلکہ ملکی سطح کے مشاعروں کا اِنعقاد بھی ہوتے دیکھا ہے، جن میں ملک کے مشہور ومعروف شعراء کرام شرکت کرتے تھے، اِس زمانے میں جن شعراء کو، میں نے دیکھا اور سُنا ہے اُن میں سے چند ایک کے نام ابھی تک مُجھے یاد ہیں، مثلاً حفیظ جالندھری، اختر حسین اخترؔ، رساؔ جاودانی اور عرشؔ صہبائی۔ جناب عرشؔ صہبائی کو میں نے اور بھی کئی مشاعروں میں سُنا۔ میں اُن کے کلام سے کافی حد تک متاثر تھا، لیکن اِن سے باقاعدہ ملاقات کا شرف اُس وقت حاصل ہوا جب والدِ محترم کے انتقال کے بعد میرے چار بھائیوں نے مل کر والد کے کلام کو ترتیب

دینے اور چھپوانے کا کام مجھے سونپ دیا، یہ کام بہت مشکل تھا کیوں کہ والد صاحب نے اپنی حیات میں کسی غزل یا نظم پر نظرِ ثانی کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی، شاید اُنہیں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں تھی، لہٰذا اِس کلام کی اشاعت سے پہلے اس پر نظرِ ثانی کروانے کے سِلسلہ میں، مَیں جموں چلا گیا اور نور الزّماں صدیقی نورؔ سے ملا، اُنہوں نے تھوڑے سے کلام پر نظرِ ثانی کی مگر اُن کی ناسازگار صحت اِس کام کی تکمیل میں رُکاوٹ بنی اور وہ اِس پر پوری توجہ نہ دے سکے، میں اِس سِلسلے میں کافی فکر مند تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایسے میں ڈاکٹر شہاب عنایت ملک نے مجھے اِس سِلسلے میں عرشؔ صہبائی کی طرف رجوع کرنے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ خود میرے ساتھ اِن کے دولت کدہ پر پہنچے، اُن سے میرا تعارف کرایا اور تفصیل کے ساتھ مدعا بیان کیا۔ عرشؔ صاحب سے پہلی مُلاقات میں ہی ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں اُنہیں برسوں سے جانتا تھا، اُنہوں نے ہمارا خیر مقدم بڑی گرم جوشی سے کیا اور خوشی خوشی یہ کام یہ کہتے ہوئے اپنے ذمّے لے لیا کہ ''ادب کی خدمت کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے''۔

میرے والد صاحب کی کتاب ''نظم بریں'' کے نام سے شائع ہونے کے بعد میں نے خُود اُن کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ وہ ایسی شاعری کے علم بردار ہیں جس کی عمارت کی بُنیاد نکات و رموزِ فن پر استوار ہے اور اِس میں فنی لحاظ سے پوری مہارت رکھتے ہیں، اُنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی، اِنہیں آزاد شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں، اُن کی شاعری تمام فنی لوازمات سے مالامال ہے، چنانچہ میں اُن سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتا رہا، یہاں تک کہ میں نے اُن کی نگرانی میں اپنی غزلیات کو

ترتیب دے کر "صدائے دِل" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرایا اور اس مجموعے کی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ہوئی۔ یوں اپنے کام کے ساتھ ساتھ عرشؔ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور خط و کتابت کا سِلسِلہ بھی جاری رہا، جس سے اُن کی شخصیت تہہ در تہہ میری نظروں کے سامنے آتی گئی اور اُن کی زندگی کے مختلف باب اور پہلو میرے رُوبَرو کُھلتے گئے۔

ابتدائی ملاقاتوں میں میرا یہ تاثّر تھا کہ عرشؔ صاحب صرف ایک اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری معلومات میں اِضافہ ہوتا گیا اور میں اُس وقت چونک پڑا جب اُن کی نثری تصانیف "انجمکدہ" "یہ جانے پہچانے لوگ" "تشکیل" (طنزیہ اور مزاحیہ) اُردو شعرا کے تذکرے، دوسرے شعرا کے شعری مجموعوں کے دیباچے تبصرے اور مضامین میری نظر سے گزرے۔

نثر میں موصوف کا اندازِ بیان اچھوتا اور نرالا ہے۔ اُنہوں نے نثر میں بہت ہی سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ قاری ایک بار جو پڑھنا شروع کرے تو تب تک اُسے نہیں چھوڑتا جب تک کہ اُس کو مُکمل نہ پڑھ لے۔

عرش صہبائی نے اپنی شاعری کا آغاز اُس وقت کیا جب وہ رنبیر ہائی اسکول جموں میں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے وہ معروف شاعر جناب جوشؔ ملسیانی صاحب سے چند برسوں تک مشورہ سخن کرتے رہے، آپ نے غزل کو اپنے اِظہار کا وسیلہ بنایا یہی وجہ ہے کہ ابھی تک آپ کے ۱۱ شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں یہاں تک کہ آپ کی کچھ غزلیں جموں کشمیر کے

اسکولوں میں اُردو کے دسویں جماعت کے نصاب میں بھی شامل ہیں، آپ کے شائع شدہ مجموعوں میں ''شکستِ جام''،''شگفتِ گل'' ''صلیب'' ''اسلوب'' ''اساس'' ''ریزہ ریزہ وجود'' ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' ''نایاب'' ''توازن'' اور ''تجھ بن چین کہاں'' (دوہے) وغیرہ ہیں۔ اِن مجموعوں میں کئی مجموعے ریاستی کلچرل اکیڈمی سے اِنعام یافتہ ہیں۔

اگرچہ اِن کی شاعری تکنیک کے اعتبار سے فن کے روایتی انداز میں ہے لیکن ان کی نظر عصری حالات و مسائل پر بڑی گہری ہے جن کا احاطہ اُنہوں نے اپنے کلام میں جا بجا بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے، زبان و بیان واضح اور رواں ہے جس سے اِن کے کلام کی سادگی نمایاں ہوتی ہے، اِن کی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلو اجاگر ہیں، یہی وجہ ہے کہ اِن کے پُر اثر اور معنی خیز اشعار میں درد و غم بھی ہے، محبت بھی ہے، پریشانی بھی، خوشی بھی ہے امید بھی، مایوسی بھی ہے، سچائی اور ایمانداری بھی۔ اپنی شعری صلاحیت سے وہ پورے معاشرے کو بے نقاب کرتے ہیں اِن کی شاعری میں لوگوں کے لئے تعمیر و اصلاح کا پیغام بھی ہے اور لحہ، فکریہ بھی، طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے، فنی اسلوب کی پابندی بھی، سادہ و سلیس زبان اور چھوٹی بحروں کا استعمال ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے اشعار سیدھے دِل میں اُتر جاتے ہیں۔

ادب لازمی طور پر تخلیق کار کی شخصیّت کی پہچان ہے لیکن یہ شخصیت محض خلاء میں تشکیل پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس کے اِرتقاء میں خارجی عوامل و محرکات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں اور فن کار پر جو کچھ اطراف کی زندگی اور اس کی حقیقتوں کے

ہاتھوں گزرتی ہے وہ انہی کو فن کی زبان میں ادا کرتا ہے۔ اس لئے کسی تخلیق کار کی ذہنی کیفیات اور فکری رویّوں پر غور و فکر کرنے کے لئے اس کے خارجی ماحول کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ عرشؔ میں فطرت پرستی کا میلان بھی اپنے عروج پر ہے، پس ان تمام رجحانات و میلانات کا بھرپور عکس عرشؔ کے کلام میں دکھائی دیتا ہے جس کا مفصّل جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، تاکہ عرشؔ کے ذہنی ارتقاء اور تخلیقی رجحان کے اسباب و عوامل واضح طور پر قاری کے سامنے آسکیں۔

میں نے عرشؔ صاحب کی شخصیّت اور فن سے متعلق وسیع اور تفصیلی بحث کی ہے اور ان کے کلام کو ہر کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے، چونکہ میرا اصل موضوع شخصیّت اور فن ہے اس لئے ان کی جملہ اصنافِ سخن کو معرضِ بحث و تنقید میں لایا گیا ہے جو اِن کا وسیلۂ اظہار بنی ہیں۔ عرشؔ کے تخلیقی شعور کو سمجھنے کے لئے، اسے تاریخی، سماجی اور ادبی پسِ منظر میں پیش کیا ہے۔ اُردو ادب میں اس ترتیب و توازن اور شرح و بسط کے ساتھ عرشؔ کی شخصیت، شاعری اور شاعرانہ حیثیت پر یہ منفرد کتاب ہوگی۔ عرشؔ کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین کرنا آسان نہیں کیونکہ اس کا حجم بہت زیادہ ہے اور اِس کا دائرۂ فکر مختلف اصنافِ سخن پر محیط ہے، اِس لئے موضوع کی اہمیت و افادیت کو خیال میں رکھتے ہوئے اِس کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے

بابِ اول میں حیاتِ عرشؔ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادب کا تعلق زندگی سے گہرا اور اٹوٹ ہوتا ہے لیکن ادب کی تفہیم و توزین، شناخت و تحقیق میں خود ادیب یا شاعر کی زندگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، فنکار تو خود اپنی زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کا عکس صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے فکر و

فن کو سمجھنے کے لئے اس کی زندگی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، ہم نے اس باب میں اِن کی سوانح حیات مرتب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، جس میں ولادت، خاندان، آغازِ شاعری، تعلیم، ازدواج اور اولاد، ملازمت وغیرہ کا ذِکر کرتے ہوئے ان کی شاعری پر ان حقائق وعوامل کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ عرشؔ شرافت، وضع داری، خوش اخلاقی وانکسار کا مجسمہ ہیں۔ اِن کی انسان دوستی، فراخ دلی، نیک اور سادہ طبیعت اور شریفانہ اطوار نے انہیں اُردو شعری دُنیا میں ایک محترم شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔ عرشؔ اپنے ہم اثر ادبأ وشعرا میں ہر کسی سے محبّت کرتے ہیں، بلا امتیاز مذہب ومِلت ہر ایک کے لئے اِن کے دِل میں خلوص ومروّت ہے۔ پاکیزگیٔ طبع، پُر وقار، بے تعصب اور سنجیدہ شخصیت اور نیک کردار نے اُن کی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے اور وہ معلمِ اخلاق کی حیثیت سے بھی اُبھرتے ہیں۔ راقم نے عرشؔ کی سوانح حیات کے ساتھ اُن کی شخصیت وکردار کو بھی ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔

باب دوم میں عرشؔ کے کلام اور اُن کی ذات پر مختلف جرائد میں تبصروں کی صورت میں شائع شدہ اُردو شعراء وادباء کی آرا پر بحث کی گئی ہے جو زیادہ تر ۱۹۵۹ء سے تعلّق رکھتے ہیں جب کہ اُن کی شاعری اِبتدائی مراحل میں تھی۔

باب سوم عرشؔ کی غزل گوئی سے متعلق ہے، اس باب کی ابتداء میں اُردو غزل کے اِرتقا اور اس کے موضوعات کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے تا کہ اس پسِ منظر میں عرشؔ کی غزلوں کی حیثیت کا تعیّن کیا جا سکے۔ عرشؔ جتنے اعلیٰ شاعر ہیں اتنے ہی اعلیٰ انسان بھی ہیں، عرشؔ میں وہ تمام اوصاف وخصائل موجود ہیں جو غزل کے لازمی عناصر بنتے ہیں۔ عرشؔ نے اپنی غزلوں میں رودادِ محبت کے علاوہ فلسفۂ غم، فلسفۂ حیات اور

انسان دوستی کے جذبات کو پیکرِ غزل میں سمو کر جدید غزل کی روح کو ایک نئی بالیدگی عطا کی ہے۔عرش کی غزلوں میں وسعت ،تنوع اور ہمہ گیریت ملتی ہے، کہیں کائنات کے اسرار و رموز تو کہیں عصری معاملات و مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے اور کہیں حیات کے حقائق و غوامض کو موضوعِ غزل بنا کر غزل کی فنی روایت میں نئے رنگ بھرے گئے ہیں اور غزل کو نیا آہنگ دیا گیا ہے۔

عرش شعر و ادب میں زبان کی شائستگی، نفاست ،نرمی ، رچاؤ اور گھلاوٹ کے قائل ہیں ۔دِل کی فطری کیفیت اور انسانی نفسیات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔جس طرح خیال فِطری اور سادہ ہے، ویسے ہی الفاظ کی سادگی اور اشعار کی بندش صاف ستھری اور رواں ہے جس سے اندازِ بیان میں انوکھا حُسن پیدا ہو گیا ہے۔

شاعری زندگی کی مختلف کیفیتوں کا ردِعمل ہے۔یا پھر انہی تجربوں کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش ہے، معنویت میں لذّت و کیف، جمالیاتی قدروں کا احساس ہے۔اِس میں وضاحت اور اِشاریت مِلتی ہے، جمالیاتی قدروں کا احساس کِسی چیز، کِسی خیال ، کِسی کیفیت کی اہمیت معلوم کرنے سے پیدا ہوتا ہے، معنویت شاعری کو تاثر دیتی ہے۔جسے ادبی زبان میں رس کہا جاتا ہے۔نفسیاتی کیفیت مثلاً محبت دوستی ،مروّت ،سوز و گداز ،ہم آہنگی اِن رسوں کی حامل ہوتی ہے۔

احساسات و محسوسات حقیقی معنوں میں شاعرانہ و جمالیاتی ہوتے ہیں، ہر چیز کا روحانی پہلو مرکزی اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور اپنے وجود کا احساس کراتا ہے، معنویت و تاثیر ہمیں خالص اِنسانیت کا احساس کراتی ہے، انسان کے لئے قیمتی چیز

دولت وثروت نہیں بلکہ اِنسانیت ہے یعنی اپنے آپ کو پالینا، جس سے حیات سکون اور طمانیت حاصل کرسکتی ہے، المختصر شاعری ثقافتی سوغات ہے، کیونکہ یہ معاشرے کے اقدار کی عکاسی کرتی ہے۔

عرشؔ فطری طور پر شاعر ہیں اور ذوقِ شعر اِن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اِن کی شاعری اپنی ارفع خصوصیات کی وجہ سے اُردو زبان میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ الفاظ کا صحیح اِستعمال اور ان کی خاص ترتیب وترکیب شعر میں موسیقیت اور غنائیت پیدا کر دیتی ہے۔ اِس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بُلند ہو جاتا ہے، عرشؔ کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اِس کے ساتھ ہی اِن کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اِس کے پڑھنے سے دِل پر چوٹ تو لگتی ہے لیکن وہ لُطف سے خالی نہیں ہوتی۔ اِن کی زبان میں لطافت، فصاحت، سادگی، سوز و گداز، جدّت اور تاثیر، ایسی خُوبیاں ہیں جو اُردو کے چند برگزیدہ شعرائیں میں پائی جاتی ہیں۔

عرشؔ کے کلام کی فصاحت اور شگفتگی سے خاص سرور حاصل ہوتا ہے کیونکہ اِن کا کلام اِن کی طبیعت وسیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت اور حقیقت سے مملو ہے۔ اِن کا ہر شعر اِن کے دردِ دِل کی تصویر ہے، اِن کی غزلوں سے اِن کی طبیعت کا رنگ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اِن کی شاعری اِن کے دِل کی کیفیت ہے۔ عرشؔ کا کلام پیچیدہ استعارات، بعید از قیاس تشبیہات، مبالغہ اور خلافِ فطرت دعوؤں سے پاک وصاف ہے۔ وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ اور صاف زبان میں ایسے دِل کش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ دِل میں اُتر جاتی ہے، غرضیکہ عرشؔ کا کلام بہ لحاظ فصاحت وروانی سہلِ ممتنع

ہے۔ جس سے کلام کی خُوبی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اُس کے کلام کی تاثیر ہے۔ عرشؔ کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں، اِن کا کلام حسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہے جو ہر خاص و عام کے دِلوں پر نقش ہوتا ہے۔ اِن کے اشعار ملائم، دھیمے سلیس اور سادہ ہیں جن میں غضب کا تلذّذ چھپا ہوا ہے، الفاظ کی سلاست اور حُسنِ ترتیب اِن کے اشعار میں حُسن و خُوبی پیدا کرتے ہیں جو اُن کا ایک خاص انداز ہے۔ اِن کے اسلوب میں بڑی خُوبی یہی ہے کہ یہ سیدھا سادہ اور البیلا ہے، نمونے کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں۔

جو مزاجاً فقیر ہوتے ہیں
زِندگی کے صفیر ہوتے ہیں

آج کی زندگی کی اور کروں کیا تفسیر
جِس طرح راہ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا سا

یہ عین لازمی ہے کہ ہر بات حد میں ہو
لبریز ہو تو جام چھلکتا ضرور ہے

زندگی سے فریب کھاؤ گے
اس پہ کرنا نہ اعتبار کبھی

رسوماتِ کہن جو توڑتے ہیں
وہی حالات کا رُخ موڑتے ہیں

کچھ اور بھی باتوں کا مَیں ممنونِ کرم ہوں
غم بھی مرے حالات کے غمّاز رہے ہیں

یہ میرا تجربہ ہے عرشؔ اس میں ہے یقیں میرا
کہ دل ہو صاف جس کا ذہن بھی زرخیز ہوتا ہے

مرے وطن میں سلامت ہیں جب سیاست دان
مرے وطن سے کبھی مِٹ سکے گی غربت کیا؟

زبان کی سلاست اور فصاحت کے ساتھ ساتھ، کس قدر دِل کش نرالا اور پُر تاثیر اندازِ بیان ہے، بیان میں تازگی، ادائے مطالب میں شگفتگی اور خیال میں بُلندی و جدّت ہے۔ اِن کے اشعار میں الفاظ خیال کے ساتھ اس طرح ہم آغوش ہیں کہ لفظ خیال کی مکمّل توثیق وتصریح کرتے ہیں۔

عرشؔ کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار کی بھی کمی نہیں ہے۔ اخلاق ہو یا حکمت، داخلی کیفیت ہو یا خارجی مشاہدہ، نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بُلند مضامین بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں۔ اِن کے طرزِ بیان اور ترتیب وبندش میں اُن کے قلبی واردات واحساسات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے، اُن کی جدّتوں میں اُن کے تیور صاف نظر آتے ہیں۔

عرشؔ کی شاعری کے بُنیادی موضوعات حُسن وعشق، انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں، فطرت اور جمالیات ہیں۔ ان میں لوچ، نرمی اور دھیما پن ملتا ہے، وہ اِنسان دوستی کا گہرا احساس رکھتے ہیں، جمالیاتی کیفیتوں کے ساتھ باطنی کرب کی ایک

دھیمی لہر اُن کی پوری شاعری میں رواں دواں ہے جو آج کی زندگی کی پیچیدگی اور آج کے انسان کے ذہنی تناؤ کی غماز ہے۔

عرشؔ کے کلام میں طنز و مزاح بھی ہے جو ایک زبردست اخلاقی قوت ہے۔ جو معاشرے کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ عرشؔ کے طنز و مزاح نے اُردو ظرافت کو ایک شُستہ ذہن اور شائستہ لہجہ دیا ہے، اُن کے مزاج کو خالص ادبی مزاج کہا جاسکتا ہے جس میں شعرا و ادب کی صدیوں کی صدائے بازگشت مِلتی ہے، مرقع نگاری اور تنقیدی مزاج بھی۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ شاعر کا طرزِ بیان اُس کی سیرت اور طبیعت کا پرتَو ہوتا ہے۔ عرشؔ کی وضعداری کی مثال یہ ہے کہ اُنہوں نے شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا بلکہ اُن کا صبر واستقلال، اِن کی قناعت و بے نیازی، اِن کی غیرت اور وضعداری وہ خُوبیاں ہیں جو اِنسان کو اوجِ اِنسانیت پر پہنچاتی ہیں۔

عرشؔ کی شخصیّت اور فنی دین کا احاطہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن اِس پر ابھی تک کِسی نے توجہ نہیں دی، ابھی تک اُن کی کتابوں پر ناقدین کے مضامین اور تبصرے لکھے ہوئے ملتے ہیں جو محض سرسری نوعیت کے ہیں۔ گویا یہ کمی رہی کہ اُن کے متعلق ابھی تک کوئی جامع کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی، یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی تحقیق کے لئے عرشؔ کی شخصیت اور فن کا انتخاب کیا تاکہ اُنکے کلام اور زندگی کے سبھی گوشے روشن ہوں۔ جن پر بے توجہی کی دُھند چھائی ہوئی ہے۔ بالخصوص اُن کی شاعرانہ ہمہ گیری اور اُن کی عظمت کو سامنے لایا جاسکے۔

عرشؔ گوناگوں صِفات کے مالک ہیں۔ نثری تصانیف کے ساتھ

ساتھ اُن کی شعری تخلیقات میں غزلیں، نظمیں قطعے اور دو ہے شامل ہیں، اُن کے دو ہے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

افشا ہو گا راز یہ جب ہو گی تحقیق
میں اُس کی تخلیق ہوں یا وہ مری تخلیق

پہلے وہ ناراض تھا اب ہے دل سے دور
چھوٹے چھوٹے زخم ہی بنتے ہیں ناسور

ہم ہیں شبنم کی طرح جب نکلے گی دھوپ
ہوں گے اور ہی رنگ میں ہوں گے اور ہی روپ

پینے کو پانی نہیں بجلی کا بُحران
اس پر بھی کہتے رہو اپنا دیش مہان

باب چہارم میں عرشؔ صہبائی کی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات کو درج کیا گیا ہے۔ ان واقعات سے ان کی شخصیّت کے مُختلف پہلو سامنے آتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہر ذمے داری کو بخوبی انجام دیا ہے اور غربت و افلاس میں انہوں نے ثابت قدمی اور صبر و تحمّل کو کیسے بروئے کار لایا ہے۔ یہ واقعات ان کی شاعری کا محرّک بھی بنے۔

عرشؔ بناوٹ اور دِکھاوٹ نام جیسی بدعتوں سے بہت دور ہیں۔ وہ بے باک اور حق گو انسان ہیں۔ وہ کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرتے اور بات مُنہ پر کہنے

میں جھجکتے نہیں۔ اس کے باوجود اِس نامور ادیب و شاعر کے مداحوں کی کوئی کمی نہیں ہے اسے نہ صرف ریاست جموں و کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں پذیرائی حاصل ہے اور اکثر پنجاب ، ہماچل پردیش، دہلی، کلکتہ وغیرہ میں مُلکی سطح کے مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کو اُردو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

عرشؔ کے گراں قدر کارنامے، لِسانی خدمات اور اِن کی شاعرانہ صلاحیت میرے لئے دِلچسپی کا موجب بنے۔ علاوہ ازیں بحیثیت ان کے ایک شاگرد کے، میں نے اِن کی فن کارانہ شخصیت کو اجاگر کرنا اور اُن کی زندگی کے مستور پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اپنا فرضِ اولین سمجھا۔ تا کہ اُنہیں دُنیائے ادب میں جائز مقام مِلے، جس کے وہ مستحق بھی ہیں۔ میں اِس تصنیف سے ہر گز یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ عرشؔ دورِ حاضر کا سب سے بڑا فن کار ہے بلکہ میرا مقصد یہ طے کرنا ہے کہ فن کار کِس حد تک اپنے فن کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ یعنی فن کو کہاں تک مکمل کیا ہے، کیونکہ فن کی حد کوئی متعین نہیں کرسکتا اور نہ اِس کی تکمیل ہی ہوسکتی ہے۔ اِسے نہ تو ماضی میں کوئی مکمل کرسکا اور آئندہ بھی اِس کے اتمام کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ لہٰذا میں نے عرشؔ کے متعلق اپنے خیالات کا اِظہار کرتے وقت اِن سب حقائق کو مدِ نظر رکھنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اِن کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے اور خوبیوں کی ستائش میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے۔ اس ضرورت ہی کو مدِ نظر رکھ کر میں نے یہ فیصلہ لیا کہ اُن کے حالاتِ زندگی اور اِس کے پسِ منظر میں اِن کی شخصیت و شاعری پر ایک مفصّل اور جامع کتاب شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر ادب میں اُن کا مقام متعین کیا جائے۔

میں اللہ تبارک تعالیٰ کا ممنون ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور میری یہ پہلی تنقیدی کاوش کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئی۔ میں اِس کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، معلوم نہیں۔لیکن مجھے اپنی جگہ یہ اُمید کامل ہے کہ قارئین میرا حوصلہ بڑھائیں گے۔

آخر میں، مَیں اپنے دوستوں اور بُزرگوں کا شکر گُزار ہوں جنھوں نے میری کتاب ''عرشؔ صہبائی۔شخصیت اور شاعری'' کی ترتیب و اشاعت میں اپنے تعاون اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اِن میں محترم بشیر احمد بشیرؔ بھدرواہی، محترم محمد الیاس تنویرؔ، محترم نذیر احمد نازؔ نظامی، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، عزیزم جاوید اقبال قاضی، محترم امین بنجارا، ڈاکٹر محمد اقبال زرگر اور ڈاکٹر شفقت حُسین رفیقی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

میں خصوصی طور پر محترم نذیر احمد نازؔ نظامی کے زیرِ اہتمام کام کر رہے، شان کمپوزنگ ہاؤس عمر آباد محلہ کاہی، بھدرواہ کا تہہِ دِل سے ممنون ہوں جنھوں نے اِس کتاب کا مسودہ بہت ہی محنت اور لگن سے خوبصورت انداز میں کمپوز کیا۔ جبھی یہ کتابی صورت میں پیش کرنے کے قابل ہُوا۔

مَیں برادرِ اکبر محمد علی قاضی اور برادرانِ اصغر اختر اقبال، فاروق اقبال اور جاوید اقبال قاضی کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میرے کام کو سراہا اور فخر محسوس کیا۔ اپنی اہلیہ چاند بی بی اور بچوں (سلمیٰ انجم، نوید شبیر) کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے ہمیشہ میرے لئے گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول بنائے رکھا جس سے میرے تخلیقی کام سرانجام پاتے رہے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ کتاب ہذا عرشؔ شناسی میں معاون ثابت ہوگی۔

پروفیسر ایس اے قاضی شاذؔ شرقی

بھدرواہ (جے اینڈ کے)

باب اول

عرشؔ صہبائی

حالاتِ زندگی

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کا آغاز ڈوگرہ عہد

یعنی ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے دَور سے ہوا۔ کیونکہ اِس سے قبل یہاں فارسی زبان اور ادب کا چلن تھا۔" ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک نقیبوں کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اِس غرض کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ بھی ڈوگرہ دربار میں فعلی جاہ وجلال کا انداز پیدا کریں، چناچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تو اِس کی آمد کا اعلان فعلی انداز سے کیا جاتا تھا۔ اِن نقیبوں کے ساتھ اِن کے پورے پورے خاندان بھی ہوا کرتے تھے جن کی بول چال کی زبان اُردو تھی۔ اِس طرح سے بھی اُردو زبان کا عمل دخل ریاست میں شروع ہوا" اگر چہ ڈوگرہ سلطنت میں بھی ریاست کی درباری زباں فارسی تھی، لیکن خطہ جموں کے مختلف علاقوں میں لوگوں کا عام بول چال ڈوگری زبان میں تھا جو لسانی اعتبار سے اُردو کے بہت قریب ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ یہاں اُردو زبان اپنے ادبی خدوخال مرتب کر چکی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء۔۱۸۸۵ء) کو نئے علوم وفنون سے کافی دِلچسپی تھی۔ جس کی وجہ سے اِس نے اپنے دربار میں بہت عالم و فاضل جمع کئے تھے۔ مہاراجہ کا وزیرِ اعظم دیوان کرپارام کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا، وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاستی انتظامی صورتِ حال پر اُردو زبان میں رپورٹیں مرتب کیں۔ جنہیں ریاست میں اُردو نثر کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس دور کا پہلا اخبار ۱۸۸۲ء میں بدیا بلاس سرکاری گزٹ کے طور پر جاری ہوا۔ جو دیوناگری اور اُردو میں شائع ہوتا تھا۔ اِس عہد کے اہم ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کا نام سرِ فہرست ہے جو شبلیؔ اور حالیؔ کے ہم

عصر تھے، خستہ کی گلدستہ کشمیر اُردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے جو لاہور سے شائع ہوئی اِن کے کئے نثری کارنامے ہیں۔ جن میں انشائیے بھی شامل ہیں ۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ (۱۸۸۵ء) کے دور میں اُردو زبان ذریعۂ اظہار بن گئی تھی اور مہاراجہ نے اِس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اِسے سرکاری زبان کا درجہ بخش دیا۔ اِس دور کے دوسرے اہم نثر نگار ہر گوپال خستہؔ کے چھوٹے بھائی سالک رام سالک ہیں۔ سالک کی اُردو خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی شروعات میں ریاست کا رابطہ اخبارات کے ذریعے لاہور اور دوسری جگہوں سے قائم ہوا۔ محمد الدین فوقؔ اِس عہد کے سب سے بڑے ادیب تھے، اُنہوں نے ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ اور شاعری وغیرہ کے شعبوں میں متعدد کارنامے انجام دئے۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار جموں سے شائع کیا۔ جس نے اُردو نثر کی توسیع اور ترقی کی راہیں کھول دیں، اِس سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا جن میں مولوی زین العابدین، سالک رام کول، جیا لعل مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشب بندھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، رسا جاودانی، عشرتؔ کشتواڑی، نشاطؔ کشتواڑی دیا کرشن گردشؔ، غلام حیدر چشتیؔ، قیس شیروانیؔ، تاراچند ترسل سالکؔ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۳ء میں سری نگر کا پہلا اخبار "وتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں شائع ہوا۔ اِس دور کے ادیبوں میں دینا ناتھ در یکو شاہد، نیاز کامراجی، انور پریمی، وشوا ناتھ درماہ، آنند کول بامزی، شیام لال ایمہ، تیرتھ کاشمیری اور پریم ناتھ سادھو

رونقؔ جو بعد میں پردیسی کے نام سے مشہور ہوئے، کے نام قابل ذکر ہیں۔

ریڈیو کشمیر سرینگر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ جس کو سمت اور رفتار دینے میں جن عظیم فن کاروں کا ہاتھ رہا ہے اِن میں بیدیؔ، عباسؔ، پردیسیؔ، سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، موہن لال ایمہ ، قیصر قلندر، غلام رسول نازکی، پران کشور، علی محمد لون، کمال احمد صدیقی، جتندر رادھم پوری، عبدالغنی شیخ، سوم ناتھ سادھو، پشکر بان، زبیر رضوی، کے، کے، نیر، عرشؔ صہبائی، مے کش کاشمیری، رساؔ جاودانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ نندلعل طالبؔ کاشمیری، منشی محمد دین فوقؔ، پنڈت سالک رام سالک، کشپ بندھو، رسا جاودانی، کشمیری لال ذاکر، حامدی کشمیری، حبیب کیفی، پریم ناتھ بزاز، میر غلام رسول نازکی وغیرہ ہیں۔

مندرجہ بالا تذکرے سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچے کہ سرزمینِ جموں وکشمیر شعر وادب میں کافی مردم خیز رہی ہے ۔یوں بھی ریاست جموں وکشمیر اپنے قدرتی مناظر کے لئے مشہور ومعروف ہے اور قدرت نے اِسے خاص تہذیب وتمدن سے بھی مالا مال کیا ہے۔ امن واستقلال اِس ریاست کا خاصا رہا ہے، یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ عالمی برداری، اخوت اور بھائی چارہ یہاں کی تاریخ رہی ہے، یہاں کے قدرتی مناظر سے شاعروں اور ادیبوں کو ایک تحریک ملتی ہے، یہ سرزمین صوفیوں اور سنتوں کے لئے قرار کی جگہ رہی ہے، یہ ریاست شعر وادب، عقل وحکمت اور علم وعرفان کا گہوارہ رہی ہے، اِس سرزمین میں متعدد قد آور اور بُلند مرتبہ شاعروں اور ادیبوں کا جنم ہوا۔ جنہوں نے جموں کشمیر کا نام برصغیر میں روشن کیا ہے اور تاریخِ ادب میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا ہے، ایسے شاعروں، ادیبوں کی

فہرست بہت ہی طویل ہے، جن کے نام نہایت اختصار کے ساتھ اوپر درج ہیں۔ اِس کارواں کے عالموں، فاضلوں، دانشوروں، شاعروں اور نقادوں کا ذکر کرتے وقت ہم جناب عرشؔ صہبائی کی نگارشات اور ادبی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔ ادبی دُنیا میں وہ اپنا ایک ممتاز اور قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں اور اِن کا تعلق بھی اِسی جنتِ بے نظیر ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں سے ہے۔

ولادت

دسویں جماعت کے دستاویز (سرٹیفکیٹ) کے مطابق عرشؔ صہبائی کا یومِ ولادت ۳ دسمبر ۱۹۳۰ء ہے جبکہ اِن کی جنم کنڈلی کے مطابق یہ ۴ دسمبر ۱۹۳۰ء ہے، وہ جموں سے کافی دُور اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ سیری پلائی (باختن) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جموں سے بذریعہ بس پہلے اکھنور اور پھر اکھنور سے پلانوالہ جانا پڑتا ہے۔ پلانوالا چھمب سیکٹر میں واقع ہے۔ مناور توی کے اُس پار چھمب ہے اور اِس طرف کا پلانوالہ چھمب پاکستان میں ہے۔ ۱۹۷۱ء کی ہندوپاک جنگ کے بعد سے یہ پاکستان کے قبضے میں ہے۔ چھمب کے شمال کی طرف توی بہتی ہے۔ جو چھمب تک پہنچنے کے بعد مناور توی کہلاتی ہے۔ اس توی کو کئی بار عبور کرنے کے بعد ایک پہاڑی کو سر کرنا پڑتا ہے۔ تقریباً آٹھ گھنٹے کا پیدل سفر طے کرنے کے بعد ہم مُتعلقہ وادی سیری پلائی (باختن) میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں دُور دُور تک کچھ مکانوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ یہ تمام علاقہ پتھریلا ہے، کہیں کہیں کوئی درخت دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہے، چھوٹے طبقے غربت کی وجہ سے بڑے گھروں میں کام کر کے اپنے بچوں کو روزی روٹی فراہم کرتے ہیں۔ دُور دُور تک غربت وافلاس کا جال بچھا ہوا ہے۔ بہت کم ایسے گھرانے ہیں جو خوشحال ہیں ایسے گھرانوں میں عرشؔ صہبائی کے ننھیال بھی شامل تھے۔ (عرشؔ کے ننھیال صِرف اِن کی نانی صاحبہ کی وجہ سے تھے۔ جن کے انتقال کے بعد وہاں مکان کی گری ہوئی دیواروں کے علاوہ محض پتھروں کے ڈھیر ہیں۔)

یہ وادی پہلے ۱۹۴۷ء کے ہندوپاک فسادات کا شکار ہوئی اور دوسری بار

یہ وادی پہلے ۱۹۴۷ء کے ہندو پاک فسادات کا شکار ہوئی اور دوسری بار ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس کی تباہی و بربادی ہوئی۔ دونوں بار یہاں کے مقامی لوگوں کو جموں کے مختلف مقامات کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کی فوجیں یہاں نہ پہنچ سکیں۔ باختن میں اب بھی دُور دُور تین چار گھرانے رہتے ہیں۔ عرشؔ ابھی تک اپنی جائے پیدائش کو بھلا نہیں پائے ہیں، وہاں کی مٹی کی خوشبو انہیں ابھی بھی معطر کرتی ہے انہیں اِس بے نظیر وادی کے اُجڑنے کا سخت افسوس ہے، اپنی ایک غزل کے مقطع میں وہ باختن کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

یہ باختن ہے یہاں عرشؔ کا جنم تھا ہوا

زمیں کا ٹکڑا جو بنجر دکھائی دیتا ہے

بچپن باختن میں عرشؔ نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال گزارے، قدرت کی ستم ظریفی کہ موصوف ابھی ۲۲ دِن کے ہی تھے کہ اِن کی والدہ محترمہ رام رکھی اس جہانِ فانی سے اِنتقال کر گئیں اور وہ والدہ صاحبہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ اِنہیں اس بات کا احساس تک بھی نہیں کہ والدہ کی محبّت کیا چیز ہوتی ہے، اُن کے والد صاحب جناب مادھو رام ابرول جموں میں رہتے تھے، وہ فوج میں حوالدار اسکول ماسٹر تھے اور ۱۲ روپے ماہانہ پنشن پاتے تھے، عرشؔ صاحب کے بڑے بھائی جناب ودیا پرکاش ابرول جموں میں والد صاحب کے پاس رہتے تھے اور وہیں زیرِ تعلیم بھی تھے، اس زمانے میں سرکاری اسکولوں میں داخلے کے لئے کم سے کم سات سال کی عمر درکار ہوتی تھی۔ عرشؔ اس لئے بھی اپنی

نانی صاحبہ کے پاس رہے کہ اِن کی مناسب دیکھ بھال ہوتی رہے، عرشؔ صاحب کے کہنے کے مطابق اُن کی نانی محترمہ پاروتی نہایت ہی نیک دِل خاتون تھی، گھر میں نوکر چاکر بھی تھے کسی چیز کی کمی نہیں تھی وہ خود ہی اِن کا پوری طرح خیال رکھتی تھیں۔

عرشؔ کی نانی صاحبہ نے عرشؔ کا نام ہنسراج ابرول رکھا تھا، عرشؔ کہتے ہیں کہ پوری وادی میں یہ پہلا نام تھا جو ڈھنگ کا تھا ورنہ وہی سیدھے اُلٹے نام جو آج سے کئی برس پہلے رکھے جاتے تھے۔ عرشؔ کی نانی صاحبہ کے میکے لالہ موسیٰ (پاکستان) میں تھے اِس لئے وہ اِن کے ساتھ اکثر وہاں جایا کرتے تھے، وہیں سے اُنہوں نے پنجابی زبان سیکھی جسے وہ آج بھی پسند کرتے ہیں، جب عرشؔ سے دورانِ گفتگو اِن کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ اُنہیں آج بھی اپنے بچپن کے تمام واقعات یاد ہیں اور ہر بات دِل پر نقش ہے، وہ کہتے ہیں کہ اُنہیں پتھروں اور نوکیلی جھاڑیوں کی وادی سے آج بھی بے اِنتہا محبّت اور عقیدت ہے۔ وہ اِس وقت تک کئی بار سیری پلائی جاتے رہے جب تک اُن کی نانی صاحبہ حیات تھیں۔

موصوف اپنے بچپن کے سات سال کا عرصہ پورا ہونے کے بعد اپنے والدِ محترم کے پاس جموں چلے آئے، کیونکہ اب اُن کی پڑھائی کا سوال تھا اور ننھیال میں کوسوں دُور تک کوئی اسکول نہیں تھا۔ وہاں زندگی کی کوئی ضرورت بھی مشکل سے ہی پوری ہوتی تھی، اگر لوگوں کو پینے کا پانی میسّر تھا تو محض اِس لئے کہ گاؤں کے نزدیک توی (دریا) بہتی تھی، جہاں تک بجلی کا سوال ہے وہ آج تک بھی کہیں دِکھائی نہیں دیتی۔ طنزاً عرشؔ صاحب نے کہا کہ "ہاں برسات کے موسم میں آسمانی بجلی کبھی کبھی گرجتی ہے" جب برسات میں توی کا پانی چڑھ جاتا ہے تو لوگوں کا آپسی رابطہ بھی دیر تک ختم ہو جاتا

ہے اور وہ کئی روز تک کہیں آ جا نہیں سکتے جس سے علاقہ کی خستہ حالی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

جموں میں عرشؔ صاحب اپنے والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے ہاں کوئی رشتہ دار عورت بھی نہیں تھی جو اِن کی دیکھ بھال کرتی۔ عرشؔ کے بڑے بھائی صاحب سے پہلے ایک بچی نے جنم لیا تھا۔ وہ بچپن میں اتنی ذہین تھی کہ سب کو شک تھا کہ یہ شاید زندہ نہ رہ سکے، وہ اکثر غیر متوقع باتیں کرتی تھی آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ عرشؔ کے والد صاحب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد گھر پر ہی رہتے تھے۔ اِن کا وقت بچوں کی دیکھ بال اور گھر کے لئے ضروری سامان فراہم کرنے میں گزرتا تھا، اُنہوں نے اپنی زندگی نہایت غریبی اور تنگ دستی میں گزاری۔ بچوں کی پرورش کے مدِ نظر دوسری شادی نہیں کی۔ موصُوف ایک صاف دل اور نیک دِل اِنسان تھے۔ وہ ذات پات میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک اِنسانیت سب سے بڑا مذہب تھا۔ اگر چہ اِن کی زندگی مصیبتوں اور تنگی میں گزری لیکن زندگی بھر کِسی کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ وہ اِس بات کے قائل تھے کہ اِنسان کو اتنے ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں جتنی کہ چادر ہو۔ یعنی وہ حد درجہ کفائت شعار تھے۔ اِن باتوں کا اثر اِن کی اولاد پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ عرشؔ صاحب خود ایک خوددار شخصیت کے مالک ہیں۔ کفایت شعاری اِن کا شیوہ ہے اور سادگی اِن کا پیشہ۔ جس کا اقرار وہ خود یوں کرتے ہیں

ہم نے پھیلایا نہیں ہر گز کبھی دستِ سوال
ہم بزرگوں کی دُعا سے پھولتے پھلتے رہے

جیسے کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کی عرشؔ کے نانہال آسودہ حال تھے۔ اِس لئے وہاں سے کوئی بھی شخص، کسی ذاتی کام کی غرض سے جموں چلا آتا تو اِن کی نانی صاحبہ کوئی نہ کوئی ضرورت کی چیز ارسال کرتیں۔ جو ایک معمول تھا۔ یہ سِلسِلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حالات خوش گوار رہے اور آنے جانے میں کوئی دِقت پیش نہ آتی رہی۔

آباواجداد

عرشؔ صاحب کے آباواجداد ریاست کے قدیم باشندے تھے۔

آپ کے جدِ امجد ضلع اُدھمپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''جِب'' کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں جموں سے اُدھمپور جاتے ہوئے ''گھڑی'' گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ کے خاندان کا شمار ''جِب'' کے معزز زمیندار گھرانوں میں ہوتا تھا۔ آپ کے پردادا گاؤں کی قابلِ احترام ہستی تھے۔ گاؤں کے لوگ اکثر اپنی مشکلات کا ازالہ کرنے اِن کے پاس آتے تھے۔ عرشؔ صاحب کے دادا شری نارائین داس نہایت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ جموں منتقل ہونے کے بعد عرشؔ کے والد نے کچی چھاؤنی میں ایک مکان خرید لیا اور مستقل طور پر وہاں رہائش پذیر ہوئے۔ عرشؔ صاحب ۱۹۷۴ء میں اپنے برادرِ اکبر کے اِنتقال کے بعد کچی چھاؤنی سے ریشم گھر منتقل ہو گئے اور اب جدی رہائشی مکان کچی چھاؤنی میں اِن کے بھائی صاحب کا کنبہ رہایش پذیر ہے۔

بقول عرشؔ صاحب اِن کے گھر میں غربت کا دور دورہ تھا۔ شہر میں اِن کے کئی رشتہ دار ہونے کے باوجود، کسی نے جھانک کر بھی اِن کے غریب کدہ میں نہیں دیکھا۔ عرشؔ اور اِن کے بڑے بھائی دونوں وقت کا کھانا تیار کرنے

اور دوسرے گھریلو کاموں میں اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آغازِ تعلیم

عرشؔ جب پہلی جماعت میں داخل ہوئے تو اِن کا اسکول اِن کے گھر کے ساتھ ہی تھا ۔ بعد میں یہ اسکول اِن کے گھر کے نزدیک دھونتھلی بازار میں منتقل ہوگیا اور دھونتھلی پرائیمری اسکول کہلایا۔ غربت کے باوجود عرشؔ کے گھر کا ماحول بڑا شگفتہ تھا، اِس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اِن کے والد صاحب نہایت خوش طبع شخصیت کے مالک تھے۔ جو مصیبت بھی آتی اُسے خندہ پیشانی سے جھیل لیتے تھے۔ عرشؔ فرماتے ہیں کہ خوش طبع ہونے کی وجہ سے اِن کے والد میں مزاح بھی تھا۔ اِن کے دِل میں محبّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ جِس سے بھی مِلتے مُسکرا کر ملتے اور اپنے دِل کی کیفیت کِسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔

پرائمیری اسکول کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد عرشؔ گورنمنٹ رنبیر ہائی اسکول جموں میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہوئے۔ چھٹی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک اِن کے فارم ماسٹر لالہ کرپا رام مینگی تھے، جو بے حد اچھے اِنسان تھے اور طالب علموں کو اپنے بچوں سے عزیز رکھتے تھے۔ اِن کے پڑھانے کا طریقہ بھی الگ تھا۔ وہ طالب علموں میں بے حد مقبول تھے۔ عرشؔ ذہین بھی تھے اور صحت مند بھی ۔ وہ دسویں تک اپنی جماعت کے مانیٹر ہوا کرتے تھے، موصوف کھیلوں میں بھی کافی دِلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن بقول عرشؔ کھیلوں نے کبھی اِن کی پڑھائی متاثر نہیں کی۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کی وجہ سے ملک بھر میں حالات غیر یقینی تھے۔ عرشؔ

کہتے ہیں کہ کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی۔ ہر چیز میں بکھراؤ تھا۔ اِس صورتِ حال نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کی وجہ سے وہ پڑھائی کی طرف پوری توجہ نہ دے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دِسویں جماعت کا امتحان دوسرے سال پاس کر سکے۔ اِس زمانے میں سرکاری اسکولوں میں اُردو زبان عام طور پر پڑھائی جاتی تھی، لیکن جو طلباً ہندی پڑھنا چاہتے اِن کے لئے کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن اِتنا ضرور ہے کہ ہندی پڑھنے والے طلباء کی تعداد کافی کم ہوا کرتی تھی۔ عرشؔ صاحب کے والد صاحب چونکہ خود بھی اُردو خواندہ تھے اور فوج میں اُردو مدرّس رہے تھے اِس لئے عرشؔ صاحب نے بھی اسکول میں اُردو مضمون کو اپنایا۔ اِس سِلسلے میں اِن کے والد صاحب اِن کی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے۔ اِن دنوں اسکول سے گھر آ کر تختی لکھنا ایک لازمی جزو ہوتا تھا لہٰذا وہ اپنے والد صاحب کی نِگرانی میں تختی لکھتے اور اسکول کا باقی کام کرتے تھے

آغازِ شاعری

عرشؔ صاحب کے کہنے کے مطابق اِن کے ذہن میں شاعری کے جراثیم آٹھویں جماعت سے ہی پنپنے لگے تھے۔ اِس سِلسلے میں اِن کے محرّک اِن کے اُردو مدرس مولوی محمد عبداللہ تھے۔ جنھوں نے طالب علموں کو شاعری کی طرف راغب کیا تھا۔ وہ مہینے میں ایک آدھ بار طالب علموں کو دو گرہوں میں تقسیم کر دیتے اور بیت بازی شروع کراتے۔ طلبا بھی اس میں کافی دِلچسپی دکھاتے تھے۔

عرشؔ نے اپنے برادرِ اکبر کے متعلق صِرف اتنا ذکر کیا کہ اگرچہ وہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن انہیں شاعری سے دِل چسپی ضرور تھی، اِنہوں نے اپنی ڈائیری میں کئی اچھے شاعروں کے اشعار نوٹ کر رکھے تھے، اِن کا شعر و شاعری کا شوق یہیں تک محدود

تھا۔ اِن کی یہ بات قابلِ تعریف تھی کہ انہوں نے شاعری کے سِلسلے میں عرشؔ صاحب کی کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

رنبیر ہائی سکول میں عرشؔ صاحب مختلف اَدبی و نیم ادبی نوعیت کی تقریبات میں حصّہ لیتے رہتے۔ وہ اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر وہ ہنس راج ابرول سے عرشؔ صہبائی بنے تو یہ سب کچھ اُن کے اُردو کے مدرس جناب محمد عبداللہ کی وجہ سے تھا۔ جنھوں نے اسکول میں بیت بازی کا سِلسِلہ طلبأ میں شروع کر کے عرشؔ کے اندر کے فن کار کو اُبھارا۔ آٹھویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک عرشؔ کے ادبی ذوق میں کافی پیش رفت ہو چکی تھی۔ یہاں اِس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ موصوف نے کالج کے دوران بطور شاعر اپنی پہچان بنانی شروع کر دی تھی۔ اِس کے بعد اُن کی شہرت میں بتدریج اِضافہ ہوتا گیا۔

اب موصوف گھر کا کھانا بنانے سے بھی آزاد تھے۔ کیونکہ جب وہ نویں جماعت کے طالب عِلم تھے تو اُن کے بڑے بھائی کی شادی بمقام ریاسی ہو چکی تھی۔ اِس طرح گھر کا تمام کام کاج اُن کی بھاوج صاحبہ نے سنبھال لیا تھا۔ شادی سے پہلے اُن کے برادرِ اکبر کو سرکاری ملازمت بھی مِل چکی تھی۔ اُن کی باقاعدہ سرکاری ملازمت کا آغاز ریجنل ریسرچ لیباٹری جموں سے ہوا تھا، جہاں وہ عالمگیر شخصیت کرنل سر رام ناتھ چوپڑہ صاحب کے ساتھ پی، اے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اِس سے پہلے وہ عارضی طور پر فوج کے کِسی شعبہ میں بھی کام کرتے رہے تھے۔ اِس سے گھر کی مالی صورتِ حال بہتر ہوتی گئی۔ اِن کے والد صاحب نے بھی قدرے چین کا سانس لیا تھا۔ عرشؔ صاحب کی تعلیم کے تمام اخراجات بھی اُن کے بڑے بھائی صاحب

برداشت کرتے تھے۔ اُن کی زبردست خواہش تھی کی عرشؔ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں اور ایک اطمینان بخش زندگی بسر کرسکیں۔ لیکن عرشؔ کے کہنے کے مطابق اُن کے بڑے بھائی صاحب کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

اِس زمانے میں جموں میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور عرشؔ اِن مشاعروں اور ادبی تقریبات میں محض ایک سامع کی حیثیت سے شامل ہوا کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں عرشؔ کی گھریلو زندگی یعنی زیرِ بحث موضوع کو چھوڑ کر بہت آگے نِکل آیا اور اِن کی ادبی زندگی کا تذکرہ لے بیٹھا۔ بہتر یہی ہوگا کہ پھر سے زیر بحث موضوع کو آگے بڑھایا جائے۔

گھریلو زندگی

عرشؔ صاحب سے جب بھی اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں بات چھیڑی، انہوں نے کسی بات پر پردہ پوشی نہیں کی بلکہ بڑے فخر کے ساتھ وہ مصائب اور مُشکلات کا ذکر کرتے ہیں جن سے وہ گزر چکے ہیں۔ وہ کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ جب وہ اِس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اُن کے اسکول پہن کر جانے والے کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذاق کررہے ہیں لیکن جو شخص خُود عمر بھر حالات کا اور دوسروں کے مذاق کا موضوع رہا ہو وہ اِنسان کیونکر مذاق کرسکتا ہے۔ اُن کی زندگی کے ابتدائی حالات اتنے تلخ رہے ہیں کہ اِن پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ عرشؔ صاحب بڑے حوصلے اور ایمانداری سے اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بچپن میں اُنہوں نے گھر میں کبھی پھل وغیرہ نہیں دیکھے بلکہ اِن کی نمائش صرف بازار میں دکانوں پر ہوتی تھی۔ وہ گھر میں جب کھانا وغیرہ تیار کرتے تو کوشش

کرتے کہ ایک وقت کی تیار شدہ سبزی دونوں وقت کام آ جائے۔ لیکن کئی بار وہ خراب ہو جاتی کیونکہ گھر میں کوئی فرج وغیرہ نہیں تھا کہ گرمیوں میں اِسے بروئے کار لایا جاتا۔

عرشؔ صاحب کے کپڑے بے شک پیوندہ اور میلے ہوتے تھے لیکن وہ باطن کے صاف تھے۔ اُن پر قدرت کا یہ بڑا کرم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اخلاق اور محبت سے اپنے حلقہ میں شامل افراد کے دِلوں پر حکومت کی اور ایک ایسا عکس قائم کیا جس پر وہ آج بھی فخر کرتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ اِنسان کی زندگی میں مصائب اور مشکلات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ یہ چیزیں اِنسانیت کے راستے پر چلنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں، اِن سے زندگی کی مضبوط بُنیاد قائم ہوتی ہے اور اِنسانیت کا وقار بڑھتا ہے۔ روپیہ تو آج کے سیاست دانوں کے پاس کروڑوں کی تعداد میں ہے لیکن اُنہیں کوئی بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ایسے روپے سے کیا حاصل۔ ہاں زندگی کی آسائشیں اُنہیں ضرور حاصل ہیں جن سے عام ایماندار لوگ محروم ہیں۔

عرشؔ صاحب کچی چھاؤنی محلّہ میں جس مکان میں رہتے تھے وہ کچا تھا، اِس خیال سے کہ برسات کے موسم میں بارش کا پانی چھت سے ٹپکے گا اِس کی لپائی عین ضروری ہوتی تھی۔ اِس مقصد کے لئے بازار سے کچی مٹی اور بھوسا خرید لیا جاتا اور چھت کی لپائی کے کام کا فرض عرشؔ صاحب خُود سرِ انجام دیتے تھے، وہ گھر کا کام کاج کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ والد صاحب کی خدمت میں بھی مصروف رہتے اور اُن کی دُعائیں حاصل کرتے۔ اُنہوں نے کبھی کِسی گھریلو کام میں شرم محسوس نہیں کی اور اسے فرض سمجھ کر ادا کیا۔ عرشؔ صاحب زیادہ وقت کھیل کود میں گزارتے

تھے۔ گھر آکر اُنہوں نے کبھی کتاب پر نظر نہیں کی۔ وہ بے حد ذہین تھے بلکہ بعض ہم جماعتوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ کبڈی اُن کا من پسند کھیل تھا۔ بچپن میں وہ بے حد صحت مند تھے۔ اُن کے کہنے کے مطابق کبڈی کھیلنے والوں کی جس پارٹی میں وہ شامل ہوتے اِس کی جیت یقینی ہوتی تھی۔

عرشؔ صاب جب اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتے، تو اسکول پہنچنے کے لئے بہت کم وقت ہوتا۔ اِس کا یہی ایک حل تھا کہ تیز رفتاری سے کام لیا جائے۔ اِس طرح وہ مقررّہ وقت سے بھی پہلے اسکول پہنچ جاتے۔ سری رنبیر سنگھ ہائی اسکول تک اُن کے گھر سے تقریباً نصف گھنٹے کا راستہ ہوتا تھا۔ اِس کا ردِعمل یہ ہوا کہ اُنہیں تیز چلنے کی عادت پڑ گئی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بھی وہ جب دوستوں کے ساتھ کہیں پیدل نکلتے ہیں تو اُنہیں چھوڑ کر کافی آگے نکل جاتے ہیں۔ بے شک بعد میں اُنہیں دوستوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ انہیں بعد میں اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کچھ دوست بھی اُن کے ہم سفر تھے، لیکن اب یہ عادت بن چکی ہے اِس کے لئے کئی بار شرمندہ بھی ہوتے ہیں اور معذرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اِس سے وہ سفر کرنے کے بھی عادی ہو چکے ہیں وہ اِس میں خوش رہتے ہیں۔ روزانہ دو تین کلومیٹر سفر اُن کا مشغلہ ہے۔ سردی کا موسم ہو یا گرمی کا اُنہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اِس کے لئے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے ہیں۔

عرشؔ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ پڑھائی کے دوران ذہین طلباء میں شمار کئے جاتے تھے لیکن حساب میں وہ بے حد کمزور تھے اگر وہ دسویں کا امتحان پاس کر سکے تو محض اِس لئے کہ وہ جیومیٹری میں تاک تھے۔ حساب میں نمبروں کی جو کمی تھی وہ جیومیٹری کی

وجہ سے پوری ہوگئی۔ یہاں اِس بات کا ذِکر بے محل نہیں ہوگا کہ سری رنبیر ہائی اسکول میں جناب محبوب الحق جو پاکستان کے وزیرِ خزانہ بھی رہے، اُن کے ہم جماعت تھے۔ دونوں میں گاڑی چھنتی تھی۔ محبوب کے والد جناب عبد العزیز اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جو پاکستان وجود میں آنے کے بعد وہاں منتقل ہو گئے۔

یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ عرشؔ صاحب کو کسی واقعہ کی کوئی تاریخ یاد نہیں۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ زندگی کے ۷۸ سالوں میں پھیلے ہوئے واقعات اُنہیں اس طرح یاد ہیں گویا یہ کل کی بات ہو۔ جناب عبد العزیز کے وقت اسکول میں جناب تیج رام کھجوریہ بے حد مقبول مدرّس تھے۔ عرشؔ صاحب اُن سے تاریخ کا مضمون پڑھا کرتے تھے۔ عرشؔ آج بھی اُن کی بے حد عزّت کرتے ہیں اور ملاقات کے وقت دونوں ہاتھ جوڑ کر اُن کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، کھجوریہ صاحب بھی عرشؔ صاحب کی ذات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور نہایت محبّت اور خلوص سے ملتے ہیں۔

عرشؔ صاحب سے جب ماضی کے واقعات سُنتے ہیں، تو صرف ایک ہی کمی کا احساس ہوتا ہے کہ اِن میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی پھر بھی یہ غنیمت ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے جموں صوبہ میں دیوا بٹالہ پر حملہ کیا تو عرشؔ صاحب ریڈیو پر یہ خبر سُنتے ہی اپنے دو دوستوں کے ساتھ (جناب کرشن لعل زرگر اور جناب سُندر سنگھ) جموں سے اپنے نانہال کے لئے روانہ ہو گئے تا کہ وہ اپنی نانی صاحبہ کو جموں لے آئیں۔ اُن کے نانہال دیوا بٹالہ سے ایک طرف تھے۔ موصوف دو دِن کا پیدل سفر طے کر کے نانہال پہنچے۔ لیکن اُن کی نانی صاحبہ نے آنے سے انکار کر دیا اور اپنے اِس فیصلے پر بضد رہیں کہ وہ جہاں رہتی ہیں اُسی مٹی میں مل جائیں گی۔ ۱۹۶۵ء

میں بھی یہی صورتِ حال رہی۔ وہ جموں آکر پھر واپس چلی گئیں اور بعد میں وہیں اُن کا اِنتقال ہوا۔ عرشؔ صاحب اُن کے انتقال سے چند روز قبل اُن کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ جب کہیں عرشؔ کا ذکر ہوتا تو اُن کی نانی صاحبہ بتاتیں ''اُس نے تو بچپن میں بھیڑ بکریوں کا دودھ پیا ہے'' عرشؔ ابھی ہنس راج ابرول ہی تھے کہ اُن کی نانی صاحبہ داغِ مفارقت دے گئیں۔

عرشؔ اور اُن کے بڑے بھائی صاحب اسکول کی تعلیمات کے دوران جب کبھی ننھیال جاتے تو اپنے قیام کے دوران گھر کے نوکر کو کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ یہاں تک کہ کھیت سے بھینس کے لئے چارہ خود کاٹ کر لاتے۔ اُن کی نظروں میں سب اِنسان ایک جیسے تھے۔ یہ تو کمزور صورتِ حال ہوتی ہے جو اِنسان کو کِسی دوسرے اِنسان کے پاس نوکری کرنا پڑتی ہے۔

جذبۂ خدمتِ والدین

عرشؔ صاحب کا ایک اہم گھریلو واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ اِن کے دِل میں اپنے والدین کی خدمت کرنے کا کِتنا جذبہ تھا۔ اِن کے والد صاحب عمر رسیدہ تھے۔ اِن کی زبردست خواہش ہوتی تھی کہ رات کو کھانے کے ساتھ پینے کے لئے کنویں کا پانی ہو۔ اِس غرض سے عرشؔ صاحب شام ڈھلے توی کے نزدیک ایک مشہور کنواں ہے، وہاں پانی لینے کے لئے چلے جاتے۔ وہاں بہت بھیڑ ہوتی تھی کیونکہ شہر میں کئی جگہ اُس کنویں کا پانی فروخت بھی ہوتا تھا۔ اِس لئے بعض اوقات رات کے آٹھ بھی بج جاتے۔ عرشؔ صاحب تقریباً رات ساڑھے آٹھ بجے گھر پہنچتے۔ اِس کے بعد رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔

موصوف اِس سے بہت خوش ہوتے کہ وہ والد صاحب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کے والد صاحب کو حقّہ پینے کی بھی عادت تھی اِس لئے صبح اُٹھنے کے بعد عرشؔ کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ حقّہ صاف کریں اور اِس کے لوازمات کا اِنتظام کریں۔ اِن کے والد صاحب محسوس کرتے تھے کہ بچوں کو اِس سے پریشانی ہوتی ہے اور اِس مقصد کے لئے اُنہیں صبح جلدی جاگنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ تمباکو نوشی سے ہمیشہ دور رہیں۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ عرشؔ اور اُن کے بڑے بھائی صاحب تمباکو نوشی سے ہمیشہ دُور رہے۔

عرشؔ صاحب کہتے ہیں کہ یہ اُن کے والد صاحب کا ہی اثر تھا کہ اُنہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر اُن سے کبھی گھر کی کسی چیز کا نقصان ہو جاتا تو وہ فوراً اِس کا اعتراف کر لیتے۔ چونکہ وہ خود برائی سے پرہیز کرتے اِس لئے اگر دوسرے اُن سے برائی کرتے تو وہ اُسے پسند نہیں کرتے۔ زندگی میں عرشؔ کا نظریہ ہمیشہ تعمیری رہا ہے۔ اِس بات کا ثبوت اُن کی زندگی میں قدم قدم پر ملتا ہے۔

ملازمت

عرشؔ صاحب نے کالج کو خیر باد کہنے کے بعد اپنی ملازمت کا آغاز ریجنل ریسرچ لیبارٹری جموں سے کیا۔ لیکن یہاں وہ بڑی مشکل سے تین سال کا عرصہ گزار پائے ہوں گے کہ ملازمت سے استعفیٰ سے اُنہیں کوئی باز نہ رکھ سکا۔ جب راقم الحروف نے اُن سے اِس اِستعفے کی وجہ دریافت کی تو وہ یوں گویا ہوئے۔ ”ریجنل ریسرچ لیباٹری چونکہ ایک سائنسی تجربہ گاہ تھی، جہاں ہر وقت جانوروں وغیرہ پر تجربات ہوتے رہتے تھے۔ اِس طرح معصوم جانوروں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ یہ منظر مجھ

سے برداشت نہیں ہوتا تھا اِسلئے میں کسی ایسے موقعہ کی تلاش میں تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دے سکوں"

اِس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف دِل کے کتنے نرم واقع ہوئے ہیں۔ اگر ایک حساس دِل شاعر نہیں ہوگا تو کون ہوگا؟ ملازمت سے استعفےٰ دینے سے قبل ریڈیو کشمیر جموں نے ایک کُل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا اِس میں لسان الاّعجاز، پنڈت میلا رام وفاؔ جیسی عظیم شخصیتیں بھی مدعو تھیں۔ اِس وقت عرشؔ کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اُنہیں بھی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ اس وہم میں بھی مُبتلا تھے کہ ریڈیو ایک ادبی ادارہ ہوگا۔ اِس وقت ریڈیو میں جو سٹاف آرٹسٹ کے طور پر لئے جاتے تھے اُنہیں تین ماہ کا کنٹریکٹ دیا جاتا تھا۔ اِس کے بعد اِس کنٹریکٹ میں توسیع کی جاتی تھی۔ اِس لحاظ سے یہ ملازمت غیر یقینی تھی۔ عرشؔ بڑی محنت اور ایمانداری سے کام کرتے تھے۔ اِس لئے توسیع کا سِلسِلہ جاری رہا، لیکن وہ اِس سے مطمئین نہیں تھے۔ کیونکہ اِس سِلسلے میں کِسی قسم کی ضمانت نہیں تھی۔

اِتفاق سے اپریل ۱۹۵۵ء میں ریڈیو اِسٹیشن میں کچھ مستقل آسامیاں نِکل آئیں اور عرشؔ کو مستقل کیا گیا۔ اِن کی ڈیوٹی اکونٹس سیکشن میں لگائی گئی۔ موصوف ریڈیو کے اُردو پروگرام میں بھی برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔ حالانکہ اِس وقت اُنہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب ریڈیو پروگرام میں اگر کوئی سٹاف ممبر جِس کا تعلق پروگرام سیکشن سے نہ ہو، شرکت کرے، تو ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اسے معاوضہ دیا جاتا تھا۔

ازدواجی زندگی

۱۳ فروری ۱۹۵۵ء کو عرشؔ ازدواجی زندگی میں بندھ گئے۔ اُن کی اہلیہ جالندھر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کا نام کملا ابرول ہے۔ شادی کا انتظام جموں میں ہوا تھا۔ عرشؔ کی شادی سے پہلے اُن کے والد صاحب اُن کو داغِ معارفت دے چکے تھے۔ اِس لئے اُن کی شادی کی تمام ذمہ داریاں اُن کے بڑے بھائی کے سر تھیں۔ جو اُنہوں نے نہایت ذمے داری سے انجام دیں۔ شادی کے دوسرے ہی روز عرشؔ کی اہلیہ جالندھر چلی گئی تھیں۔ کیونکہ وہ وہاں زیرِ تعلیم تھیں۔ جب کہ ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو عرشؔ کو اپنی نئی ملازمت پر حاضر ہونا تھا، اِس سے چند روز پیشتر وہ اپنی اہلیہ کو لانے کے لئے جالندھر چلے گئے۔

اولاد

عرشؔ سے جب اُن کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنہوں نے بتایا کہ اُنکی اہلیہ کے بطن سے اُن کی چار اولادیں ہوئیں، جن میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ اُن کی دو لڑکیوں نے ایم، اے کی تعلیم حاصل کی اور ایک لڑکی اور لڑکے نے بی اے اور بی کام کی ڈگری حاصل کی۔ وہ مزید تعلیم اِس لئے جاری نہ رکھ سکے کہ لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اُن کے فرزندِ ارجمند شری اورن کمار ابرول مرکزی حکومت کے محکمہ سی، ڈی، اے میں ملازم ہیں۔ اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ عرشؔ نے پوری ایمانداری سے بچوں سے متعلق اپنے فرائض سرانجام دئے۔ اور اپنے محدود ذرائع کے باوجود گھر کے وقار کو قائم رکھا۔ اپنے تمام بچوں کو حسبِ توفیق اعلیٰ تعلیم دِلوائی۔ اُن کی

سب لڑکیاں اپنے اپنے سسرال میں خوش ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ عرشؔ نانا بھی بن چکے ہیں اور دادا بھی بلکہ پرنانا بھی۔ تمام بچے ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بچے جب بھی اپنے ننہال میں آتے ہیں تو گھر میں ایک ہنگامے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔
عرشؔ کو اُن بچوں سے صرف ایک ہی شکایت ہے کہ وہ اُن پر رعب ڈالتے ہیں، لیکن اس میں بھی ایک مزہ ہے۔ وہ یہ بات کبھی پسند نہیں کرتے کہ اُن کا پوتا اُن کی نظروں سے اوجھل ہو۔ لیکن اسکول جانا تو بے حد ضروری ہے وہ اس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ اُنہیں یہ بھی شکایت ہے کہ وہ جتنا پیار اپنے پوتے سے کرتے ہیں پوتا اتنا پیار نہیں کرتا۔ وہ کئی بار اسے "بے ایمان" کہہ دیتے ہیں۔ لیکن گھر میں کوئی بھی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ اگر مانتا بھی ہے تو اُس کا اظہار نہیں کرتا۔

عرشؔ زندگی میں قدم قدم پر ذہنی تذبذب سے گزرے ہیں۔ لیکن مایوس نہیں ہوئے اور زندگی کے جہاد میں مصروف رہے۔ یہ غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب اُن کے بڑے بھائی سرینگر میں تھے۔ اُنہوں نے ٹیلیفون پر عرشؔ کو تاکید کی کہ وہ فوری طور پر ایک درخواست انفارمیشن آفیسر کے عہدہ کے لئے بذریعہ ریڈیو اسٹیشن ڈائریکٹر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ جموں و کشمیر کو ارسال کریں۔ درخواست میں ادبی نوعیّت کے کام کی تفصیل درج ہو، کیونکہ جناب ڈی، پی، دھر اُنہیں ریاستی حکومت کے محکمہ انفارمیشن میں انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس درخواست کی ایک نقل وہ براہِ راست اُنہیں بھی بھیج دیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دھر صاحب کو یہ کیسے علم ہوا کہ عرشؔ صاحب شری وی، پی ابرول کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابرول صاحب نے دھر صاحب کو بتایا تھا کہ عرشؔ ریڈیو کشمیر جموں سے ۱۹۵۵ء سے وابستہ ہیں۔ اگر اُنہیں

ریاستی حکومت کی ملازمت میں لیا جائے تو اُن کی مرکز کی تین سال کی ملازمت ضائع ہو جائے گی۔ لیکن دھر صاحب نے اُنہیں یقین دِلایا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کی سروس کا عرصہ بذریعہ کیبنٹ ریاستی سروس میں شامل کروائیں گے۔ جناب ڈی پی، دھران دنوں ریاست میں king maker تصوّر کئے جاتے تھے۔ اِسے عرش کی بدقسمتی کہئے کہ جب اُن کی درخواست سرینگر کے محکمہ انفارمیشن میں موصول ہوئی تو دھر صاحب اُسی روز ہندوستان کے سفیر بن کر روس چلے گئے۔ بعد میں عرش کے برادرِ اکبر محکمہ انفارمیشن کے ڈائریکٹر شری پنڈت گنیش داس شرما سے مِلے اور ساری روداد بیان کی، شرما صاحب برہمن اِزم کے زبردست پیروکار تھے۔ اُنہوں نے کہہ دیا کہ یہاں ایسا کوئی عہدہ نہیں۔ یہ اِزم کی لعنت صرف ریاست ہی میں نہیں بلکہ مختلف شکلیں بدل کر پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ کِسی حقدار کو اِس کا حق مِل سکے گا، خود سے مذاق کرنے والی بات ہے۔ عرش بھی اِس مذاق کا موضوع بنے۔ وہ تو خیریت گذری کہ وہ ریڈیو کشمیر کی ملازمت میں بھی تھے اِس لئے اُنہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ شری گیشن داس شرما عرش کو نہیں جاتے تھے۔ کئی بار سرینگر اور جموں کے مشاعروں میں اِن سے ملاقات ہو چکی تھی اور وہ اُن کی تعریف کرتے تھے۔ شرما صاحب کی برہمن اِزم پر بڑی مضبوط گرفت تھی اور وہ ہر حال میں اِس پر قائم رہنا چاہتے تھے۔

عرش نے بھی عجیب قسم کی طبیعت پائی ہے۔ جب بخشی غلام محمد ریاست کے وزیرِ اعظم تھے (بعد میں یہ عہدہ وزیرِ اعلیٰ کے لقب سے جانا گیا) عرش کو تین بار اُن کے ہاں ڈنر پر بلایا گیا۔ وہ موصوف کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن سے اُنکی ملاقات بھی مشاعروں میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے ہر بار عرش سے دریافت کیا کہ کِسی چیز کی ضرورت

تو نہیں لیکن عرشؔ نے ہمیشہ شکر یہ کہہ کر بات ختم کردی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کِسی کے آگے دستِ طلب دراز کریں۔ اُنہوں نے تنگ دستی میں بھی کِسی صورت میں خودداری کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور اِسی غیرت میں تمام زندگی گزاری۔ وہ اِس وقت بھی ایک بااصول اور ایماندار زندگی گزار رہے ہیں۔ اگرچہ اُنہیں قدم قدم پر کئی مشکلات پیش آتی ہیں۔ لیکن کِسی سے ذکر تک نہیں کرتے اور مشکلات سے سینہ سپر رہتے ہیں، لیکن ہونٹوں پر وہی دائمی مسکراہٹ رہتی ہے۔

عرشؔ زندگی میں عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ اِتنے ذہین ہوکر بھی نہایت انکساری سے ہر ایک سے پیش آتے ہیں۔ ادبی خدمات کے لئے ہروقت کمربستہ رہتے ہیں۔ وہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران کئی لوگوں کی سازشوں کے شکار رہے لیکن کبھی دِل شکستہ نہیں ہوئے۔ سازشی لوگوں سے مسکرا کر ملتے اور اُنہیں یہ احساس تک نہ ہونے دیتے کہ وہ اُن کے عمل سے واقف ہیں۔ اِس طرح اُن کی زندگی خُودساختہ زندگی ہے اگر کِسی جانکار سے کوئی سفارش کرنا ہوگی تو ضرور کریں گے لیکن دوسروں کے لئے، اپنے لئے نہیں۔ عرشؔ ملازمت کے دوران ہمیشہ اِس نظریہ کے حق میں رہے کہ اُن کی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اُن کا یہ جذبہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ ملازمت کے دوران بے حد مقبول رہے۔ وہ چاہے کلرک تھے، چاہے اکاونٹنٹ، چاہے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، اُن کے اِس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جیسے کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ریڈیو کشمیر جموں میں رہے، اُنہیں اُردو کے پروگرام میں بھی دخل حاصل رہا اور وہ اُن میں شرکت بھی کرتے رہے اور کئی دفعہ اُن سے رہنمائی بھی حاصل کی جاتی رہی۔ وہ ایسی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ اِس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھے۔ اُنہوں نے یہاں

بھی دو بار استعفےٰ پیش کیا لیکن وہ منظور نہ ہو سکا۔ اُنہیں ایسا لگتا تھا کہ وہ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ جیسے جیسے عرشؔ کی عمر بڑھتی گئی اِستعفےٰ کا خیال ترک کر لیا۔ یہ ایک قانونی مجبوری تھی۔ عمر کی حد بڑھنے کی وجہ سے مزید سرکاری ملازمت نہیں مِل سکتی اور سر پر گھریلو ذمہ داریاں بھی آ پڑی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کِسی بھی ذمے داری سے غافل نہیں تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ شاعری ذمّہ داریوں سے انحراف نہیں بلکہ شاعری سے اِنسان زیادہ حساس دِل ہوتا ہے اور اِس سے وہ زندگی کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ ملازمت کے دوران بھی اُن کے کئی دُشمن تھے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ وہ کِسی کے دشمن نہیں تھے۔ اِس جذبہ سے اُن کے دِل میں خود اعتمادی بھی تھی اور زندگی میں آگے بڑھنے کا عزم بھی تھا۔ اُن کے لئے یہ شاعری کی بہت بڑی دین تھی۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ وہ ہمیشہ عرشؔ صہبائی رہے ہیں۔ چاہے ذاتی زندگی تھی، چاہے سرکاری ملازمت۔ اگر ابتدائی زندگی کی مُشکلات اور مصائب نے اُنہیں ایک اچھا اِنسان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تو شاعری نے بھی اُن کے خیالات اور عمل میں ایک بُلندی پیدا کی۔

دہلی، جودھپور اور پنجاب میں تبادلے

غالباً ۱۹۶۶ء

میں اُن کا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ دِہلی سے وہ عارضی دورے پر جودھپور چلے گئے۔ یہاں اُن کا قیام تین ماہ تک رہا۔ اُن کی وجہ سے اس عرصہ میں ادبی ہنگاموں کا ایک سِلسِلہ جاری رہا۔ جودھپور کے مقامی شعرا نے اُنہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہر تیسرے روز وہاں ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہر شاعر اُنہیں اپنا سمجھتا تھا۔ ایسا دراصل عرشؔ کی اِنکساری کے باعث بھی تھا۔ بطورِ شاعر اُن کی شہرت ملک کے ہر حصّے میں تھی۔ لیکن اُنہیں کبھی اِس کا

احساس نہ ہوا۔ جودھپور پہنچنے کے بعد اُن کی مُلاقات شری گندھرب لعل شرما سے ہوئی۔ موصوف گوڑ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور ملازمت کے سِلسلے میں وہاں مقیم تھے۔ نہایت باذوق اِنسان تھے۔ اِن کے پاس عرشؔ کے کلام کے تراشے موجود تھے۔ اُن کے کنبہ کے افراد گوڑ گاؤں میں رہتے تھے۔ عرشؔ اُنہیں کے پاس مقیم رہے۔ جودھپور کی ادبی محفلوں میں عرشؔ صاحب کے ساتھ وہ بھی شریک ہوتے۔ اور اُن سے بے حد لطف اندوز ہوتے۔ وہ بے حد خوش تھے کہ عرشؔ کے ساتھ اُن کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ وہ بڑے خوش خلق اِنسان تھے۔ چند روز میں عرشؔ کے ساتھ گھُل مِل گئے۔ اگرچہ ریڈیو اسٹیشن پر بھی باہر سے آنے والے سرکاری ملازموں کے لئے ایک مہمان خانہ تھا لیکن عرشؔ شری شرما صاحب کے ساتھ ہی مقیم رہے۔ جہاں عرشؔ مُقیم تھے وہاں سے شہر ڈھائی کلومیٹر کی دوری پر تھا لیکن وہ دوستوں سے ملنے روزانہ شہر جاتے تھے۔ اس زمانے میں جودھپور میں میٹاڈور وغیرہ کی سہولیات دستیاب نہیں تھیں۔ بے حد پسماندہ شہر تھا۔

ایک بار عرشؔ اکیلے ہی کِسی ادبی تقریب میں شامل ہونے کے بعد گھر کی طرف آرہے تھے۔ وقت کافی ہو چُکا تھا کہ راستے میں پولیس اُنہیں پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اِتفاق سے وہاں کے ایک پولیس آفسر نے عرشؔ کو کِسی مشاعرہ میں سُنا تھا۔ اُنہوں نے بڑے احترام کے ساتھ اُنہیں کرسی پیش کی اور ایک سپاہی کو اُن کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ اُنہیں گھر پہنچا دے اور ہدایت کی کہ اگر آئندہ یہ دیر سے آئیں تو اُنہیں گھر تک پہنچا دیا جائے۔

اگرچہ جودھپور میں ستّر کے قریب مقامی شاعر تھے لیکن اِن میں سب سے سُلجھے ہوئے اور بُلند قامت شاعر جناب آزادؔ بہاولپوری تھے۔ موصوف

اسٹیٹ بنک آف انڈیا میں کسی عالیٰ عہدے پر فائز تھے۔ عرشؔ سے اُن کی خوب بنتی تھی لیکن اُنہیں عرشؔ سے ایک گلہ بھی تھا اور وہ اُنہیں ہر مُلاقات میں کہتے تھے کہ "آپ کی آمد سے میرا قد کم نہیں ہوا بلکہ ختم ہو گیا ہے" عرشؔ مُسکرا کر کہہ دیتے کہ "یہاں میرا مستقل قیام نہیں ہے" اور ہوا بھی یہی کہ تین ماہ کے بعد عرشؔ کا تبادلہ جودھپور سے گورایا (پنجاب) ہو گیا۔ وہ اپنے جودھپور کے قیام کے دوران ایک مُشاعرے میں شرکت کی غرض سے سونی پت بھی آئے۔ اِس مشاعرے کا اہتمام اُردو کے ذہین شاعر جناب پورن کمار ہوشؔ نے کیا تھا۔ جناب نریش کمار شادؔ بھی اِس میں شریک ہوئے تھے۔ عرشؔ دوستوں کو کسی صورت میں بھی ناراض نہیں کرتے تھے، چاہے اُنہیں جتنی مرضی تکلیف کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ ہوشؔ صاحب اِن کے بڑے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ عرشؔ کے اِس شعر کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیا گیا

اہلِ قلم ، مفتّی ، مصّور ، صنم تراش
ملتے ہیں مے کدے میں بلا کے ذہین لوگ

وہ خاص طور پر جناب نریش کمار شادؔ کی داد کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ گورایا میں چند ماہ کے قیام کے بعد عرشؔ کا تبادلہ پھر جموں ہو گیا۔

نئی زندگی سری نگر کے ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے کہ ایک جان لیوہ بیماری نے گھیر لیا۔ واپسی پر بڑی مشکل سے گھر پہنچے۔ پھر روز بروز

تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اگر چہ علاج جموں کے ایک شہرت یافتہ حکیم کا تھا لیکن بد قسمتی سے تکلیف جگر کی تھی اور علاج گردے کی تکلیف کا ہوتا رہا پھر الوداع کا وقت بھی آن پہنچا۔ بہ یک وقت چھ ڈاکٹر بُلائے۔ محلّے دار اور کئی کرم فرما صرف اِس وقت کا اِنتظار کر رہے تھے جب منحوس خبر کا اعلان ہو۔ معلوم ہوا کہ اُن کے خون میں زہر پھیل چُکا تھا۔ یہ liver abses کی بیماری تھی۔ دو ماہ سرکاری اسپتال میں داخل رہے۔ اُن کے جگر سے دو قسطوں میں ایک کلو پس نِکالی گئی۔ نقاہت بے حد بڑھ چکی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق عرشؔ کے ایک عزیز شری بھوش کمار گندوترہ (ریاسی) نے اپنا خون دیا ۔ ڈاکٹر اُن سے ایک بات کیلئے بے حد پریشان تھے کہ وہ اپنا بستر چھوڑ کر وارڈ میں کئی چکّر لگاتے ہیں اور اُن بیمار لوگوں کی مزاج پُرسی میں مصروف رہتے ہیں جو بے حد تکلیف میں مُبتلا تھے۔ جب کہ اُن کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اُنہیں اِس سے گریز کرنا چاہیئے تھا۔ آخر کار دو ماہ کے بعد اسپتال سے فراغت مل گئی۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ عرشؔ اِس بیماری کے جراثیم جودھپور سے لائے ہیں۔ جب وہ اسپتال سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر نے سب کی موجودگی میں کہا ''بے شک علاج نے اپنا کافی اثر دِکھایا لیکن اُنہیں اُن کی خود اعتمادی نے دوسری زندگی دی ہے'' ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے بھی عرشؔ صاحب سے کافی کام لینا تھا اور یہ خیال سو فی صدی درست ثابت ہو رہا ہے۔ عرشؔ نے اپنے مجموعہ کلام ''صلیب'' میں بھی ڈاکٹر ایس، ایل، ورما اور اُن کے معاون ڈاکٹر بھاردواج کا ذکر کیا ہے اور اُن کی اِس توجہ کا شکریہ ادا کیا ہے جس سے اُنہیں نئی زندگی نصیب ہوئی۔

فراخ دِلی اور فرائض

عرشؔ صاحب کے بڑے بھائی صاحب کا ۱۹۶۶ء سے کئی برس پہلے ڈیرہ دون کے لئے تبادلہ ہو چکا تھا ۔ ۱۹۷۶ء میں وہیں بیمار ہوئے ، آل انڈیا انسٹیچوٹ دہلی میں اُنہیں داخل کروایا گیا لیکن دو آپریشنوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اِس کے بعد اُن کی اہلیہ اور بچے جموں آگئے۔ اُن کا جدی پشتنی مکان صرف کچا ہی نہیں تھا بلکہ اِس قابل بھی نہیں تھا کہ اِس میں دو کنبے گزارہ کر سکیں۔ لہٰذا اُنہوں نے یہ مکان بھاوج صاحبہ اور بچوں کے حوالے کر دیا اور خود ریشم گھر کالونی چلے آئے۔ وہاں اُن کی ساس صاحبہ مقیم تھیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکی تھیں کہ وہ وہاں اکیلی ہیں اِسلئے اُن کے داماد اپنے کنبے سمیت وہاں آ جائیں ۔ موصوف کچی چھاونی والے جدی پشتنی مکان کے حصّہ سے بھی دست بردار ہو گئے اُنہوں نے بھاوج صاحبہ سے کہا کہ اُن کے پاس جو روپیہ ہے وہ اِس سے اِس مکان کو پختہ بنوالیں اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہیں اپنے فرائض کا کس قدر احساس تھا۔

اہلیہ کی علالت اور سلی گوری کولکتا بنگال میں تعیناتی

اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب عرشؔ ریشم گھر کالونی منتقل ہوئے، اُن کی اہلیہ گنٹھیا کی تکلیف میں مبتلا ہو گئیں۔ عرشؔ صاحب اِس سے کئی برس پہلے اکونٹنٹ بن چکے تھے۔ کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا گھریلو ذمہ داریوں میں بھی برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگر چہ اُن کے دفتر کے اوقات

۱۰ بجے تھے پھر بھی وہ صبح ۹ بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ اِس طرح شام دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ ہر قسم کے علاج کے باوجود اُن کی اہلیہ کی تکلیف میں ذرا بھی افاقہ نہ ہوا ۔ اِس تکلیف سے پہلے اُن کی سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس تکلیف سے اُن کی اہلیہ ۱۴ برس صاحبِ فراش رہیں۔ ۱۹۸۴ء میں عرشؔ صاحب کو promotion مِلی اور وہ بطور ایڈمنسٹریٹیو آفیسر آل انڈیا ریڈیو سِلی گوری مغربی بنگال میں تعینات ہوئے جہاں کے لئے جموں سے یک طرفہ سفر چار دِن کا تھا۔ وہ پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ اُن کے بچے بڑے ہو چکے تھے اُنہوں نے اُن کا حوصلہ بڑھایا جس میں اِن کی اہلیہ بھی شامل تھیں اور یوں وہ سِلی گوری چلے گئے۔ وہاں سب نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ایک تو عرشؔ صاحب دفتر کے کام سے بخوبی واقف تھے، دوسرے اُن کا حسن سلوک بھی اُن کی مقبولیت کا باعث بنا۔ موصوف سلی گوری سے دوبارہ سرکاری کام کے سِلسلے میں کولکتہ گئے۔ وہاں بھی اُن کی اہلیت کا اعتراف کیا گیا۔ سِلی گوری میں ابھی ایک سال کا عرصہ ہو گیا کہ اُنہیں کام کی غرض سے جموں آنا پڑا۔ ابھی وہ جموں میں ہی تھے کہ اُن کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو روہتک ہو گیا۔ سِلی گوری میں کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے اور کہیں جائیں۔ اُن کے ساتھ سب کا بہت اچھا سلوک تھا وہ بھی سب کو چاہتے تھے لیکن ایک ہی دِقت تھی کہ وہ گھر سے بہت دُور تھے۔ وہاں خط بھی دو ہفتوں کے بعد ملتا تھا۔ اِس پر اہلیہ کی تکلیف الگ سے پریشان کُن تھی۔ وہ چارپائی پر پڑی رہتیں۔ تکلیف نے مکمل طور پر اُنہیں جکڑ لیا تھا۔ اس پر بھی وہ مایوس نہیں تھیں بلکہ سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتیں۔

سِلی گوری میں عرشؔ صاحب صرف ایک بات کی گھٹن محسوس کرتے تھے کہ وہاں

اُردو کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں تھا۔ ایک روز وہ وہاں کی بڑی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ یہاں اُردو کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں۔ البتہ کشن گنج میں کچھ شاعر اور ادیب ہیں۔ کشن گنج سِلی گوری سے کافی دُور تھا۔ سِلی گوری میں اُردو کی کوئی تقریب بھی نہیں ہوتی تھی کہ کوئی وہاں آئے۔ اِس کے علاوہ مچھروں کی وہاں بھرمار تھی۔ عرشؔ صاحب کی ظرافت کے مطابق وہ 'مچھروں کا صدر مقام تھا' کھانا کھانے کے بعد پانی پیتے ہی پیٹ میں درد شروع ہو جاتا تھا کیونکہ پانی میں پٹرول کا جزو تھا۔ اکثر لوگوں کو پیچش کی تکلیف رہتی تھی۔ چونکہ آسام کی حد شروع ہوتے ہی پانی ابرق آلودہ ہوتا ہے، اس لئے آسام کے لوگ اکثر جزوی طور پر ٹی بی کی بیماری کا شکار رہتے ہیں۔

کولکتہ میں غربت وافلاس کے مناظر کا شعری ردِعمل

عرشؔ صاحب کے کہنے کے مطابق کولکتہ کے عام ہوٹلوں میں بھی پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سیلاب کا پانی ہے۔ عرشؔ صاحب جب بھی کولکتہ جاتے، ایک عام ہوٹل میں قیام کرتے۔ ایک عام آدمی نہایت پست زندگی گزارتا تھا۔ غربت انتہا تک تھی۔ دولت کی فراوانی صرف اُن لوگوں تک محدود تھی جو عوام کے رہنما کہلاتے ہیں اور ان پر حکومت کرتے ہیں۔ موصوف جس ہوٹل میں ٹھہرتے تھے وہ سیالدہ ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا۔ اِس کے ساتھ ایک بہت بڑا فلائی اَورتھا جس کے نیچے رات کو کم سے کم پانچ ہزار مزدور رات گزارتے تھے۔ یہ وہاں کی عوامی زندگی تھی۔ واپسی پر جب کولکتہ سے سِلی

گوری کے لئے ریلوے ٹکٹ حاصل کرنا ہوتا تھا تو رشوت دیئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ عرشؔ صاحب کا کہنا ہے کہ اِس سے کیمن اِزم کی اصلی شکل ابھر کر سامنے آتی تھی۔ کیونکہ وہاں کیمونسٹوں کی حکومت تھی۔ سِلّی گوری میں قیام کے دوران عرشؔ صاحب کھانے کے لئے کبھی پریشاں نہیں ہوئے کیونکہ وہ خود بہت اچھا کھانا بناتے ہیں اور اِس میں کبھی کِسی قسم کی دِقت محسوس نہیں کرتے۔ اُنہیں دوسروں کا بنایا ہوا کھانا کم پسند آتا ہے۔ اُن کی شخصیت کا یہ بھی ایک نمایاں پہلو ہے۔ موصوف نے بے شمار ایسی باتیں بتائیں لیکن اِس سے اِس مجموعے کی ضخامت کہیں سے کہیں جا پہنچے گی اور ہم ایک الگ راستے پر چل پڑیں گے۔

روہتک میں تعیناتی

عرشؔ صاحب کے مطابق، اُنہوں نے روہتک میں جو وقت گزارا، وہ اُن کی زندگی کا بدترین وقت تھا۔ لیکن ایک پہلو جو قابل تعریف تھا اور اطمینان بخش بھی کہ وہاں شاعر اور ادیب کافی تعداد میں تھے۔ جب مختلف شاعروں اور ادیبوں کو یہ معلوم ہوا کہ عرشؔ صاحب روہتک میں تعینات ہیں تو وہ جگہ جگہ ادبی تقریبات میں اُنہیں مدعّو کرنے لگے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کِسی بھی مشاعرہ میں عرشؔ صاحب کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ لیکن غائبانہ طور پر وہ کِس جگہ متعارف نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی تاریخ کو وہ فرید آباد کے مشاعرہ میں بھی مدعو تھے اور کھتیل کالج میں بھی۔ جب کہ اُنہوں نے کھتیل کی ادبی تنظیم کے مُنتظموں کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ فرید آباد کے مشاعرہ میں مدعو ہیں اس لئے کھتیل نہیں آسکیں گے۔ لیکن اِس کے باوجود خبروں میں وہ دونوں مشاعروں

میں شریک تھے۔ اُنہوں نے اِسے بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت بتایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر اُنہیں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو کیا صورت ہوتی۔ وہ خود سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اُن کی لطیفہ گوئی اُن کے کلام کی طرح مقبول ہے۔

روہتک سے جموّں، جموّں سے روہتک اور سری نگر میں منتقلی

عرشؔ صاحب کہتے ہیں

ایک روز بڈ گجر نام کے ایک صاحب ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو دہلی سے حکم نامہ لے کر روہتک آگئے کہ اُنہیں ایڈمنسٹریٹو آفیسر بنا دیا گیا ہے۔ اِس لئے وہ (عرشؔ) چارج اُنہیں دے دیں اور عرشؔ صاحب کو revert کر کے پھر جموں بھیج دیا گیا۔ بڈ گجر صاحب نے یہ سب کچھ کیسے کیا، یہ وہی جانتے ہیں۔ جرأت کی بات یہ تھی کہ جو ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا اسے revert کر دیا گیا اور ایک اقلیت کے بڈ گجر کو ترقی دے دی گئی اور اِس کا کوئی جواز بھی نہیں بتایا گیا۔ خیر موصوف جموں آگئے یہاں اُنہیں دفتر میں کافی پریشان کیا گیا لیکن یہ پریشانی وقتی تھی۔ اُنہیں دوبارہ ترقی دے کر پھر روہتک بھیج دیا گیا۔ روہتک سے کبھی کبھار وہ ہیڈ آفس دہلی میں جاتے تھے۔ وہ جب بھی وہاں بڈ گجر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے، متعلقہ آفیسر مسکرا دیتا۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں اقلیتی فرقے کو کس طرح تحفظ دیا جاتا ہے اور اُن کی ترقی کے کیا کیا منصوبے ایجاد کئے جاتے ہیں۔

۱۹۸۷ء میں عرشؔ صاحب کی تبدیلی ریڈیو کشمیر سری نگر میں کر دی گئی

لیکن اِس کے ساتھ اُنہیں بتا دیا گیا کہ اُس کے بعد اُنہیں آل انڈیا ریڈیو شملہ جانا ہوگا۔ دہلی میں جب اُن سے پوچھا جاتا کہ اتنی رسائی ہونے کے باوجود جموں کے لئے تبادلہ کیوں نہیں کرواتے ۔ موصوف مسکرا دیتے اور صرف اِتنا کہتے کہ تمام ہندوستان مرا گھر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں تک اُن کی رسائی کا تعلق ہے، اُس میں دو رائے نہیں ہے۔

جب ۱۹۸۷ء میں وہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ رہے، اُن دنوں وہاں کے ڈائریکٹر شری للہ کول تھے۔ ۱۹۸۸ء میں ان کا تبادلہ دوردرشن سرینگر میں کر دیا گیا۔ اُن کے لئے یہ ماحول اجنبی نہیں تھا پھر وہ ہمیشہ اُس کوشش میں رہتے کہ دوسروں کو فائدہ کِس طرح پہنچے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر کا سٹاف اِس بات سے بے حد رنجیدہ تھا کہ اُنہوں نے ایک ہمدرد اور اہل افسر کھو دیا ہے۔

بہر حال عرشؔ صاحب کو دوردرشن سرینگر میں بھی اچھا ماحول مِلا۔ یہاں بھی اُن کا بے حد احترام تھا۔ دراصل دفتر کے کام کے علاوہ اُن کے قلمی نام نے بھی اُن کی عزت میں کئی گُنا اضافہ کیا۔ یہاں ریڈیو کشمیر سرینگر کی نسبت دفتر کا کام بہت زیادہ تھا۔ کارکنوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی لیکن کیا مجال کہ کِسی کے کام میں کوئی تاخیر ہو۔

ملازمت سے سبکدوشی

عرشؔ صاحب نے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا لیکن اُن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر پی سی ہیمبرم چاہتے تھے کہ اُن کی ملازمت میں توسیع ہو۔ اُنہوں نے موصوف کو بتایا کہ وہ اِس سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کو ایک ڈی، او لکھ چکے ہیں اور ٹیلیفون بھی کر چکے ہیں۔ لیکن عرشؔ صاحب نے اُنہیں صاف الفاظ میں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ڈائرکٹر صاحب پُر اُمید تھے، کیونکہ اِس سے پہلے دو عدد ایڈمنسٹریٹیو آفسرز کی ملازمت میں توسیع ہو چکی تھی۔

عرشؔ صاحب نے ڈائریکٹر صاحب پر واضح کیا کہ وہ دونوں کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے یا اُنہیں سیاسی رسائی حاصل ہوگی، ورنہ اِس ملک میں اہلیت، ایمانداری اور قابلیت کی کوئی قیمت نہیں۔ آخر کار وہی ہوا جو موصوف نے کہا تھا اور وہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

باب دوم

عرشؔ صہبائی

کے متعلق

مستند اساتذہ کی آرا

اس سے پہلے کہ ہم عرش صہبائی کے شعری مجموعوں (شائع شُدہ اور زیرِ اشاعت) کا سرسری جائزہ لیں ہم اُن آراُ کو یکجا کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، جو مختلف جرایدٗ میں تبصروں کی شکل میں شائع ہوئیں یا اُردو شاعری کے مستند اساتذہ اور اہلِ قلم کی طرف سے موصول ہوئیں۔ جنہیں بعد میں مختلف مجموعوں میں شامل کیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ سِوائے ایک آدھ کے، یہ تبصرہ جات اور آراُ زیادہ تر ۱۹۵۸ء سے تعلق رکھتے ہیں جب عرش صہبائی کی شاعری ابتدائی مراحل میں تھی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت بھی ان کی شاعری کو کتنا سراہا گیا تھا۔ موصوف نے اُردو شاعری کو جو نئے اشعار دئے ہیں اُن کی تعداد بھی قابلِ تعریف ہے۔ اکثر اشعار نئے ہونے کے علاوہ جدید بھی ہیں اس کی وجہ شاعر کا اندازِ بیاں ہے۔ وہ ہر بات کو ایک نئے انداز میں بیان کرنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ خود کو ایک نوآموز طالب ِعلم تصوّر کرتے ہیں۔ مشاہیر کی آراُ درج ذیل ہیں:۔

"شگفتہ زمینیں تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچّھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ کلام میں عُریانی بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت کا رجحان عُریاں مضامین سے کوسوں دور رہتا ہے"

(ابوالفصاحت جناب جوش ملسیانی)

"جناب عرشؔ صہبائی کے کلام میں افکار کی طرفگی کے ساتھ ساتھ بیان کی دلآویزی بھی پائی جاتی ہے جو دورِ حاضر کے جواں سال شُعرا کے اشعار میں کبریتِ احمر کا حُکم رکھتی ہے۔ مُجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جناب عرشؔ صہبائی اصولِ فن اور صحتِ زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عُمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ دُنیائے اُردو کو اُن کی ذات سے بڑی توقعات رکھنی چاہیں۔"

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور
ایم۔اے۔پی ایچ ڈی
صدر شعبہ اُردو و فارسی و عربی پنجاب یونیورسٹی

"شکستِ جام" کلام میں نے دیکھا اُس میں ہمت و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ بڑی شدّت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ بیشتر اشعار میں عملی زندگی کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ عرشؔ صہبائی نے انہیں ذاتی تجربات اور حقائق کے سانچے میں ڈالا ہے"

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

"جناب عرشؔ صہبائی بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار نوجوان ہیں

ان کا تغزل کافی نکھر ا اور سلجھا ہوا ہے۔ شگفتگی اور رعنائی کے ساتھ
گداختگی کی بھی کمی نہیں ہے۔ زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی
بھی جلوہ گر ہے۔ عرش صاحب کا مستقبل درخشاں ہے اور حال کی
تابنا کی ان کو بہت جلد اعلیٰ مقام پر پہنچائے گی۔"

شکیل بدایونی

"عرش صہبائی اُردو غزل میں اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے
ہیں اور دورِ جدید میں وہ اُردو کے منفرد صاحبِ طرز غزل گو
ہیں۔ عرش صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح
پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے۔ ان کی غزل
میں آکر زندگی خود غزل بن جاتی ہے۔ میں اسے ان کی
انفرادیت قرار دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر جاوید وشِشٹ

"معنیٔ حیات"۔ عرش صہبائی

"نوجوانی میں غزل گوئی بے حد صبر آزما ہوتی ہے۔ رندی و حُسن
پرستی کے ساتھ غم کا گداز اور تجربے کی گہرائی ذرا بدیر آتی ہے پھر
زبان و بیان کے مرحلے آتے ہیں جہاں قدم قدم پر ٹھوکریں

کھانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاید یہی سبب ہو کہ موجودہ دور میں غزل گو شاعر مشکل سے ملتا ہے۔ عرشؔ صہبائی اس لحاظ سے مستحقِ ستائش ہیں کہ اُنھوں نے غزل کو شاعری کی جولان گاہ بنایا ہے۔ ''ایک تبسّم یک نظر'' عرشؔ صہبائی کے احساسِ حُسن میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحت مند محبت، عشق کے مرض کی سرحدوں کو نہیں چھوتی۔ ان کا عشق ایک جوان اور صحت مند عشق ہے جو ایک مسکراہٹ پر دُنیا کو نثار کر سکتا ہے اور ایک نظر سے دُنیا کا سودا کر سکتا ہے، مگر جو کائنات کی حقیقتوں اور تلخیوں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ ادھر کئی برس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے کسی شاعر کا اُردو مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔ عرشؔ صہبائی ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے ہی سب سے پہلے جمود کو توڑا ہے''

علی جواد زیدی

''میں یہ کہنے پر مجبور ہوں'' عرشؔ صہبائی کے اشعار میں قدرتی صلاحیت کو زیادہ دخل ہے اور ان کی مشق و محنت کو کم بلکہ بہت کم۔ اس لئے کہ ابھی اُن کی عمر ہی کیا ہے اس عمر میں تو شعر کے ہجے بھی نہیں آتے۔ مشق تو وہ اب کریں گے اور خدا جانے مشاق ہونے کے بعد

اس تلوار میں کتنی کاٹ پیدا ہو جائے گی۔"

ابراحسنی گنوری

"شکستِ جام" قدیم و جدید شاعری کا حسین سنگم ہے۔ رجائیت کا عنصر زیادہ غالب ہے حیات و کائنات کے نظام کی خرابی پر بھی ہلکی ہلکی نشتر زنی کی ہے جمالیات کے سانچے میں وقت کی گونج کو ڈھالا ہے۔ تغزّل کا رنگ کافی نکھرا ہوا ہے۔ شگفتگی، روانی اور سلاست ہر جگہ نمایاں ہے۔" شکستِ جام" گلرنگ و سدابہار اور غمِ جاناں وغمِ دوراں کا بہترین امتزاجی شاہکار ہے۔

شفاؔ گوالیاری

"عرشؔ صہبائی کا مزاج غزل سے زیادہ قریب ہے۔ غزل کے رمز و ایما سے آشنائی اور اظہار کی قدرت اِن کی شاعرانہ شخصیت کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پیش پا اُفتادہ مضامین ایک تازہ کار شعری پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔"

ماہنامہ "آجکل" دہلی

قوّتِ تسخیر اے جموں تری مشروط ہے
تیری دارائی نہ ہوگی عرشؔ صہبائی کے بعد

اسلم سیتا پوری

حُسن سے ان کی رسم وراہ تو ہے
چوٹ کھائی ہوئی نگاہ تو ہے

علّامہ انوؔر صابری

"ان کی غزلوں کا غالب عنصر خیال کی بے ساختگی اور پیرائے اظہار کی شگفتگی ہے"

ماہنامہ "تحریک" دہلی

"عرش صہبائی سرزمینِ کشمیر کے ایک مقبول شاعر ہیں اور غزل سرائی کی جدید راہوں کے علمبردار"

آل انڈیا ریڈیو۔ جالندھر

"مجموعہ دیکھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پختہ کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی نمائندہ غزلیں موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عرشؔ کی شاعری جو بہت کم عمر ہے، مستقبل میں کافی بلند اور کامیابی کے امکانات رکھتی ہے۔ اسلوبِ بیان میں انفرادیت اور نیا پن نظر آتا ہے۔ نت نئی ردیفیں تلاش کرنے میں اور خوبصورتی کے ساتھ ان کو نبھانے میں عرشؔ نے اپنی مشاقی اور جُستجو کا ثبوت دیا ہے۔ کلام میں رنگینی اور اثر ہے۔ اس میں ادبی لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔

ماہنامہ "مشاہراہ" دہلی

"شکستِ جام" میں شامل کی گئی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام چھوٹی بحریں ہیں۔ چھوٹی بحروں میں کام کے اشعار نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ عرشؔ صہبائی نے قافیہ پیمائی کی حد سے مزید اشعار نکالنے کے بجائے تین چار معنی خیز اور پُر تاثیر اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے اور یہ چیز بڑی مستحسن ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس مجموعہ میں اچھے اشعار اور اچھی غزلوں کی کمی نہیں۔ دلکشی، لطافت اور اثر انگیزی کے ساتھ

ساتھ شاعر کے یہاں گہرا سماجی شعور اور غلط ماحول سے شکایت بھی پائی جاتی ہے اور اس قسم کے چند دوسرے عناصر ادب کے وہ تقاضے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر ہم اپنی شاعری سے خود کو تو مطمئن کر سکتے ہیں لیکن اپنے قارین کو نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ قارین کو عرشؔ صاحب کے کلام سے اس قسم کی کوئی نا اُمیدی نہ ہو گی۔"

ماہنامہ "نئے چراغ" کھنڈوہ

"کشمیر گوشۂ جنّت ہے۔ وہاں کا حُسن، وہاں کی دلکشی وہاں کا شبنمی موسم، سب ملا کر دیکھنے والوں کو کسی اور ہی دُنیا میں پہنچا دیتے ہیں اور عرشؔ تو یہیں کے باسی ہیں۔ اگر یہ اس سرزمین پر ساغر و مینا کو ٹکرائیں اور اپنے ماحول کو میخانہ قرار دیں تو اس میں حیرت کو دخل نہ ہونا چاہیے۔ "شکستِ جام" مختصر جاموں اور خو بصُورت نازک پیمانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کا ایک ایک جرعہ، ایک ایک قطرہ بھرپُور نشے کا حامل ہے "خیال" کی تنگ دامنی اجازت نہیں دیتی ورنہ ثابت کیا جاتا کہ عرشؔ صہبائی نے موجودہ غزل کو اور کیا تحفے دئے ہیں۔"

ماہنامہ "خیال" کامپٹی (ناگپور)

''یہ حضرت عرشؔ صہبائی کا نیا مجموعہ کلام ہے۔ ان کا سارا کلام ہی سادہ اور موثّر ہے۔ اس میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ یہ شکستِ جام ہی نہیں لطفِ جام بھی ہے۔''

روزنامہ ''تیج'' دہلی

''عرشؔ صہبائی ایک نئے اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی صلاحتیں انکے روشن مُستقبل کی آیئنہ دار ہیں۔ قوّتِ احساس نے ان کے کلام میں جان ڈالی ہے۔''

روزنامہ ''ملاپ'' دہلی

''عرشؔ صہبائی کا تغزّل اُس کے تصّورات کی پاکیزگی کا آیئنہ دار ہے۔''

ماہنامہ ''کردار'' بھوپال

''عرشؔ صہبائی محض ایک فرد نہیں بلکہ تحریکِ اُردو ادب کے چند سربراہوں میں سے ہیں جن پر نہ صرف ریاست جموں کشمیر کے عوام فخر کرتے ہیں بلکہ پورا برصغیر ہندو پاک اُن کی شاعری سے معطر ہے۔ وہ محض ایک عام شاعر نہیں بلکہ وہ آج کی اُردو شاعری کی جان ہیں۔ وہ

ایک پُر خلوص اور مرنجان مرنج ہستی ہونے کے علاوہ آج کے دَور کی شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس کے میرِ کارواں ہیں۔ عرشؔ بلا شبہ اُن چند شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں جو آج کے نامساعد حالاتوں اور اُردو زبان کی کسمپُرسی کے دَور میں بھی اُردو شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے بادِ مخالف کی پرواہ کئے بغیر شمعِ ادب اور ثقافت کے پرچم کو بُلندیوں کی طرف لے جانے میں گامزن ہیں۔

میں سخن ور تو نہیں لیکن سخن شناس ہونے کی کاوش میں میرا مُصمّم عقیدہ ہے کہ جو کلام عرشؔ کا میری نظر سے گزرا ہے اس کے تناظر میں کہہ سکتا ہوں کہ عرشؔ واقعی آبروئے غزل ہیں۔ اُنہوں نے غزل کو ایک نیا رنگ دے کر اِس کو ماضی کی روایت پرستی سے نِکال کر اُسے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات سے بچا کر وہ حیثیت اور عظمت بخشی ہے جو شاید بہت سے باوجود چاہنے کے بھی نہ کر پائے ہوں۔ عرشؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کا کلام ثقیل اور نا قابلِ فہم الفاظ سے مبّرا ہے۔ عرشؔ کی شاعری ایک نایاب سرمایہ ہے۔ مُجھے یقین واثق ہے کہ عرشؔ کے شعر کہنے کا انداز اُردو غزل کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ اور آنے والا مورّخ یا تنقید نگار اگر تعصّب کی عینک سے نہ دیکھے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اُردو

غزل کا تذکرہ عرش کے کلام کے بغیر ادھورا ہے۔ مجھے عرش کا شناسا
اور ذاتی طور پر واقف کار ہونے پر فخر ہے۔"

جسٹس آر۔ پی۔ سیٹھی

سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا

"دورِ حاضر میں جہاں اُردو زبان وادب پر بازاری پن کی گرفت کو مضبوط
کرنے کی شعوری کوششیں کی جارہی ہیں، وہاں اخلاقی اقدار کے مسخ ہونے
کے کرب ناک مناظر بھی صاف دِکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں
کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہنے والے صداقت پسند اور باکردار لوگ
نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ جناب عرش صہبائی کی شخصیت اور شاعری کا
ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اِخلاقی اقدار کے اس زوال پزیر دَور میں بھی دِن کو
دِن اور رات کو رات کہنے کی جُراُت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی
پزیرائی اِس دَور میں کم ہی ہوتی ہے۔ عرش صاحب کہتے ہیں

آوازِ گمشدہ کے سِوا اور کُچھ نہیں
اِس دَور میں جو شخص حقیقت پسند ہے

عرش صاحب کی حقیقت پسند اور بے باک آواز اُنہیں ایک مُنفرد مقام بخشتی ہے۔

ناز نظامی

بھدرواہ (جموں کشمیر)

باب سوم

عرش صہبائی کی شاعری
اُن کے شعری مجموعوں کی
روشنی میں

عرشؔ صہبائی کی ذاتی زندگی کی طرح اُن کی ادبی زندگی کے حالات بھی بڑے دلچسپ اور حیران کُن ہیں۔ اگر چہ اُن کی شاعری کا آغاز اسکول میں ہی ہو چُکا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ باقاعدہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی ایسا کوئی ریکارڈ دستیاب ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اُنہوں نے کس قسم کے اشعار کہے۔ فارغ ہو کر وہ کالج پہنچے تو وہ قطعات کہتے تھے۔ لیکن اُن قطعات کا کیا ہوا اُنہیں خُود بھی علم نہیں۔ اِسی دوران اُنہوں نے افسانہ نگاری شروع کی تھی۔ اُن کے پاس اتنے افسانے جمع تھے کہ اُن کا ایک مجموعہ شائع ہو سکتا تھا۔ ان افسانوں کا کیا ہوا، اس کا بھی اُن کے پاس کوئی جواب نہیں۔ موصوف اس بات کا اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ افسانہ نگاری میں اُن کی حیثیت ایک Bathroom singer جیسی تھی۔ یہ افسانے وہیں تک محدود رہتے۔ کوئی افسانہ بھی شائع شدہ نہیں تھا۔ وہ مجموعہ کہاں گیا، اس کا کیا ہوا انہیں خود بھی اس کا علم نہیں۔ اس سے ایک بات تو ثابت ہوتی ہے کہ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ طبیعت کا رجحان چونکہ شاعری کی طرف تھا۔ اس لئے اُنہوں نے اِس طرف پوری توجہ دی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں اُنہوں نے مشاعروں میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کا پہلا غیر مقامی مُشاعرہ اُنہوں نے پٹھانکوٹ میں پڑھا جسے ہماچل کے ایک ذہین شاعر سُدرشن کوشل نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ روز بہ روز بڑھتا گیا۔ اور اُن کی شہرت پھیلنے لگی۔ اُن کے جو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو کر سامنے آئے اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔	"شکستِ جام"	۱۹۵۸ء	غزلیات
۲۔	"شگفتِ گل"	۱۹۶۱ء	"
۳۔	"صلیب"	۱۹۷۱ء	"
۴۔	"یہ جھونپڑے یہ لوگ"	۱۹۷۶ء	قطعات
۵۔	"اسلوب"	۱۹۹۱ء	غزلیات
۶۔	"ریزہ ریزہ وجُود"	۱۹۹۵ء	غزلیات
۷۔	"اساس"	۲۰۰۱ء	غزلیات
۸۔	"نایاب"	۲۰۰۴ء	غزلیات
۹۔	"توازن"	۲۰۰۵ء	غزلیات
۱۰۔	"تجھ بن چین کہاں"		اُردو دوہے
۱۱۔	"انجم کدہ"	۱۹۶۳ء	تذکرہ
۱۲۔	"یہ جانے پہچانے لوگ"	۱۹۶۶ء	تذکرہ

اس کے علاوہ اُن کا ایک شعری مجموعہ "چشمِ نیم باز" (غزلیات) زیرِ اشاعت ہے۔ اس طرح ایک اور مجموعہ "دسترس" ترتیب دے رہے ہیں۔ اُن کا مجموعہ جو اُن کی زندگی کے واقعاتی لطائف پر مبنی ہے، تشکیل کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ مُلک میں کئی ایسے تنقیدی مجموعے اور تذکرے شائع ہوئے ہیں جن میں عرشؔ صاحب کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دوسرے شاعروں کے بہت

سے ایسے شعری مجموعے ہیں جن پر عرش صاحب نے صرف نظر ثانی ہی نہیں کی ہے بلکہ اُن کے دیباچے بھی تحریر کیئے ہیں۔ کئی مجموعوں پر اُنہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں جو بے حد پسند کیئے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور تا حیات رہے گا۔ کیونکہ اُن کے کہنے کے مطابق اُن کی زندگی اُردو ادب کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ ایسے شعراُ کی طویل فہرست ہے جو اُن سے اپنے کلام پر باقائدہ اصلاح لیتے ہیں یا دوستانہ مشورہ کرتے ہیں۔ طوالت کے پیشِ نظر وہ نام یہاں درج نہیں کیئے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں عرش صاحب کا کہنا ہے کہ وہ خود ایک طالب علم ہیں اُن سے کوئی کیا فیض حاصل کرے گا؟ اُن کی طبعیت میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ صرف دوستوں کے ہی دوست نہیں بلکہ مخالفوں کے بھی دوست ہیں۔ اور ادبی نوعیت کے کام کے لئے ہر وقت حاضر رہتے ہیں۔ جن شعری مجموعوں کی فہرست دی گئی ہے اُن میں سے ''شگفتِ گل'' ''اسلوب'' ''ریزہ ریزہ وجود'' انعام یافتہ ہیں۔ لیکن موصوف انعامات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کی نظر میں معیاری تخلیقات کی اہمیت ہے۔ اور اب تو انعام حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ شاعر یا ادیب کے پاس ذرائع ہونے چاہیں۔ بڑے سے بڑا اعزاز مل جاتا ہے۔ یہاں کتنے ایسے شاعر یا ادیب ہیں جن کی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر سرکاری سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ اسے محض اتفاق جانئیے، اگر ایسا ہوتا ہے۔ بہر حال وہ شاعر یا ادیب جن کی زندگی ادب کی خدمت کے لئے مخصوص ہے، اس خیال سے نہیں لکھتے کہ اُنہیں اعزاز حاصل کرنے ہیں۔ ہم

عرش صہبائی کے شعری مجموعوں کے بارے میں مختصراً عرض کرنا چاہیں گے۔ جن سے اُن کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہو سکے۔

شکستِ جام

۱۹۴۷ء کے بعد "شکستِ جام" غالباً پہلا شعری مجموعہ تھا جو منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ کسقدر مقبول ہوا اور کسقدر شہرت نصیب ہوئی اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں اس کا دُوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آ گیا۔ سرکاری لائبریریوں میں بھی اسے فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی صرف "شکستِ جام" ہی نہیں، عرش صاحب کے دوسرے شعری مجموعے کہیں دستیاب نہیں۔ موصوف کی غزلوں میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ ان میں بھرتی کے اشعار نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قدرتی شاعر ہیں۔ اور اُن کے ہاں اتنے اشعار ہی ملتے ہیں جو انہیں کہنے نہیں پڑتے بلکہ وہ شعر اپنے آپ کو اُن سے کہلوا لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ اُن کا ابتدائی کلام ہے تاہم اُن کے اندازِ بیان اور اسلوب نے اس میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ "شکستِ جام" میں اگرچہ مے خانے، ساقی اور شراب کا ذکر ملتا ہے لیکن اس نوعیت کے اشعار میں بھی عجیب وغریب مضامین ملتے ہیں جن کی انفرادیت ہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے جب "شکستِ جام" پر تبصرہ ہوا تو اس میں کہا گیا تھا۔ اگر "شکستِ جام" میں صرف یہ شعر ہوتا ؎

وقت کی سب ستم ظریفی ہے
ورنہ انساں بُرا نہیں ہوتا

تو بھی یہ ایک مکمل مجموعہ تھا لیکن اس میں تو بے شمار ایسے اشعار ہیں۔ آیئے

اس میں شامل کچھ اشعار سے محظوظ ہوں۔

ہر گام پر تھیں ٹھوکریں راہِ حیات میں
لیکن بہ فیضِ ساغر و مینا سنبھل گئے

جبکہ مے کے سُرور سے ہر انسان بے خُود ہو کر لغزشیں کھاتا ہے سکونِ حیات کی تلاش میں یہ شعر بھی توجّہ کا مستحق ہے۔

مے کدے میں جب میسّر ہے سکونِ زندگی
کون کافر سجدۂ دیر و حرم کرتا رہے

یہ انداز بھی دادطلب ہے۔

ہم بادہ کشی ترک تو کر سکتے ہیں لیکن
دل پر غمِ دوراں کا اثر اور بڑھے گا

آج انسان جس دور سے گزر رہا ہے، عرشؔ اُس سے غافل نہیں۔ اِس شعر میں انسانیت کے فقدان کی طرف اشارہ ہے۔

ڈھونڈتا پھرتا ہے جا کے جس کو بُت خانے میں تو
خدمتِ مخلوق میں ہے وہ ثوابِ زندگی

عرشؔ زندگی میں ایک صحت مند نظریہ رکھتے ہیں۔ یہ شعر اسکی عکاسی کرتا ہے۔ وہ غمِ دوراں اور غمِ زندگی سے مطلق مایوس نظر نہیں آتے۔

آدمی آفاتِ ہستی سے اگر چاہے نجات

مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے

اُن کے اشعار میں مُشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کی بھی تلقین ہے

ہر وقت مُشکلات و مصائب کا سامنا

کہتے ہیں جس کو زیست وہ اک امتحاں بھی ہے

اور پھر یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تنگ آکر موت کو آواز دینا کُچھ نہیں

موت سے پیدا کوئی جینے کی صُورت کیجیے

''شکستِ جام'' میں جا بہ جا ایسے اشعار موجود ہیں۔ پڑھتے رہیے اور سر دُھنتے رہیے۔ یہ بات نہیں کہ اس مجموعہ میں شامل شاعری جام و مینا تک ہی محدود ہے۔ عرشؔ کے کلام میں کوئی مضمون بھی ہو وہ ایک نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم چند اشعار پیش کرنے کے بعد آگے قدم بڑھائیں گے۔

غنیمت ہے کہ راحت اور غم پہلو بہ پہلو ہیں

وگرنہ زندگی بے کیف سا افسانہ بن جائے

اس طرح رہیے نگاہوں کے قریب

میرا مفہومِ نظر بن جائیے

بات چھڑتی نہیں گو اُن کی بہت مُدّت تک

ذکر ہوتا ہے تو شام وسحر ہوتا ہے

مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر کون یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ ابتدائی

کلام ہے ؟

"کشمیر میں اُردو" (تیسرا حصّہ) میں عبدالقادر سروری عرشؔ

صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ (اس وقت تک عرشؔ صاحب کے صرف دو

شعری مجموعے "شکستِ جام" اور "شگفتِ گل" منظرِ عام پر آچکے تھے) "غزل میں ان کی

تربیت ہوئی اور غزل پر ہی اُنہوں نے زیادہ توجّہ صرف کی۔ اس صنف میں انہیں اب

ایک مقام حاصل ہو چُکا ہے۔ غزل کے آداب اور لوازم سے عرشؔ کو پُوری آگاہی ہے

اور اظہار کے اسالیب پر بھی انہیں اچھّی قدرت حاصل ہے ان کے بیان کے انداز میں

حسن بھی ہے اور فنّی رچاؤ بھی۔ "نئے تصورات اور اندازِ فکر کا پرتو ان کی غزل میں جگہ جگہ

ملتا ہے۔ عرشؔ شعر میں اظہار اور آہنگ کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ مترنّم بحریں اور شگفتہ

زمینیں عرشؔ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ وہ زبان۔ محاورے، طرزِ ادا اور شعری محاسن

کی نگہداشت کے ساتھ فنی خوبیوں کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ حیات اور کردارِ حیات کے

بارے میں ان کے اپنے کُچھ تجربات اور مشاہدات ہیں۔ یہ موضوع غزل کی شاعری

کے لئے نہیں لیکن جب شاعر کا ذاتی احساس اس کو دہراتا ہے تو وہ نئے لگتے ہیں۔ مثلاً

غالب کی طرح، جو زندگی کو بندِ غم جانتے ہوئے بھی ایک عملی مُفکّر کی طرح اس کے

امکانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور اسے عدمِ زندگی پر بہر حال فوقیت دینے پر مجبور تھے۔ عرشؔ بھی زندگی میں تلاشِ راحت و عشرت میں ناکام رہ کر بھی زندگی کے قدردان ہیں، کہتے ہیں ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوں گی نظر کی پستیاں
زندگی کو کم نظر بارِ گراں کہتے رہے

زندگی کی ہر ادا ہے دل نشیں
زندگی کی ہر ادا کی قدر کر

جب علی جواد زیدی ریاستی کلچر اکیڈمی کے سیکریٹری تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ عرشؔ ریاست میں واحد شاعر تھے جو نمایاں تھے۔ عرشؔ صہبائی کے ابتدائی کلام پر اُستادانہ کلام کا شائبہ ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ اُن کی ایجاد کردہ زمینوں سے متاثر ہو کر بے شمار شعرأ نے ان زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ بلکہ عرش کے مضامین کا بھی چربہ اُڑایا ہے لیکن کسی نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ عرشؔ نے کئی بار اس بات کو قبول کیا ہے کہ اُن کے تمام شعری مجموعے اُن کے عزیز و اقارب کے تعاون سے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اُنہوں نے بعض مجموعوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ جب ''شکستِ جام'' کا ذکر ہو تو وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہ مجموعہ میرے قریبی احباب سودیش بخشی، بال مہتہ اور بھوشن کمار زگوترہ کے تعاون سے شائع ہوا تھا۔ یہ اُن کا سب سے پہلا شعری مجموعہ تھا۔ جس سے

اُنہیں ملکی سطح پر شہرت نصیب ہوئی۔ عرشؔ صاحب کے پہلے شعری مجموعہ پر اُس وقت کے اساتذہ نے جتنی اچھی آراٗ کا اظہار کیا ہے اُن کا ایک ردِ عمل یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس شاعر کے بارے میں اسقدر تعریف کی جائے، وہ راستے سے بھٹک جائے اور اس احساس کا شکار ہو جائے کہ شاعری میں وہ حرفِ آخر ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور موصوف نے یہ نظریہ اپنایا کہ اُنہیں اس سے بھی زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔ یہ مثبت نظریہ تھا۔ آپ اُن کے تمام مجموعوں کا مطالعہ کیجئے آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ ہر شعری مجموعہ کا مُصنف الگ ہے۔ عرشؔ صہبائی جو ''شکستِ جام'' میں ہے وہ ''شگفتِ گُل'' میں نہیں۔ اُس کا فن بھی رُو بہ ترقّی ہے۔ خیالات میں پختگی ہے زندگی کے وسیع تجربات اور مشاہدات نے اُن کی شاعری کو اور رنگ دیا ہے۔ ہم اس بات کا ذکر کرنا بھول گئے ہیں کہ صرف ''اساس'' کو چھوڑ کر اُن کے تمام شعری مجموعے مکتبہ اُردو ادب جموں کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے ہیں۔ ''اساس'' یاسر گولڈن پبلشنگ ہاوس۔ ڈوڈہ کی طرف سے شائع کیا گیا۔

''شکستِ جام'' اور ''شگفتِ گُل'' میں نمایاں فرق ہے۔ مجموعہ میں زندگی کے حقائق اور اُن سے وابستہ مختلف مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ایسا شُعور کی پختگی کے باعث بھی ہے۔ اُن کے اشعار پڑھ کر یہ شک گزرتا ہے کہ اس مجموعہ کا شاعر کوئی اور عرشؔ صہبائی ہے۔

لیجئے کُچھ اشعار جواز کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ۔

اے گرفتارِ روایاتِ کہن
زندگی ہے باعثِ صد انقلاب

آدمی کو کرنا پڑتا ہے سرِ تسلیم خم
دب نہیں سکتی کبھی جو وقت کی آواز ہے
اس سے پھوٹیں گے ہمیشہ نغمہ ہائے رنج و غم
موت کے ہاتھوں میں جب تک زندگی کا ساز ہے

عرشؔ رواتیوں اور کہنہ رسموں سے انحراف کرنے کے عادی نظر آتے ہیں۔ وہ کافی حد تک ان سے نالاں بھی ہیں۔ اس کا وہ اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام
بلا سے لاکھ رسومِ کہن کے پہرے ہیں

دُنیا کی روایات نے برباد کیا ہے
دُنیا کی روایات کو سلجھانا پڑے گا

اُن کے شعور اور ہمت کی پیش رفتگی درج ذیل اشعار میں دیکھئے ؎

اگرچہ آئیں گی مُشکلیں بھی
اگرچہ کھائیں گے ٹھوکریں بھی

مگر نہ ہاریں گے اپنی ہمت
بدل کے رکھ دیں گے ہم زمانہ

اس مجموعے میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ ولولے ہیں۔ زیادہ جوش ہے۔ یہاں جو انداز اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ آپ خود اندازہ کیجئے کہ اُنہوں نے کس مقام سے یہ اشعار کہے ہیں۔

سلسلہ ہائے رسوماتِ کہن چھوڑ گئے
اپنے اجداد کی جاگیر پہ رونا آیا

کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم
ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے

مندرجہ بالا اشعار بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ عرشؔ صاف گو اور حقیقت پسند ہیں۔ بے شک اُنہیں زندگی میں اس سے نقصان اُٹھانا پڑا ہو اور اسی باعث اُن کے ارد گرد اُن کے دُشمنوں کا ایک جمِ غفیر بھی ہو۔ لیکن وہ اس سے بے نیاز ہیں اور تخلیقی عمل میں مصروف۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُنہوں نے زندگی کا ہر پہلو، سیاسی سماجی، تہذیبی جذبے کی بھٹّی میں تپایا ہے اور نکھار آنے کے بعد اسے شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ اُن کی کس کس تعریف کا ذکر کیا جائے۔ موصوف اپنے جذبات اور ہُنر سے بخوبی واقف ہیں کہ اپنے خیالات اور جذبات کس طرح اُستادانہ طریقے سے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے یہ اشعار ملاحظ کیجئے۔

وہ پستیٔ کردار ہو یا پستیٔ اخلاق

اس دور کی ہر بات کو سُلجھانا پڑے گا

بشر ہی سے اُمیدیں ہیں ہزاروں

بشر ہی کا چلن بگڑا ہوا ہے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عرشؔ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ زبان و بیان پر اُنہیں قدرت حاصل ہے۔ خیال میں نُدرت ہونے کے سبب اُن کے کلام میں تاثیر ہے۔ اُن کے لہجے میں دھیما پن ہی نہیں زبان میں مٹھاس بھی ہے۔ جو اُنہیں ایک خاص مقام عطا کرتی ہے۔ اس مجموعہ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں جہاں خیال کی بلندی، جذبات کی عکاسی، نازک خیالی اور تخیّل پروازی نمایاں ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش ہیں ؎

عرشؔ پھر کچھ بھی نہیں لُطف سُخن گوئی کا

بات میں حُسنِ سُخن کا اگر انداز نہ ہو

بے زبانی بھی تو رکھتی ہے زباں

خامشی بھی عالمِ تقریر ہے

کُچھ نہیں کھُلتا نظر کے سامنے

آپ ہیں یا آپ کی تصویر ہے

تعظیم کے قابل ہے وہی شخص جہاں ہیں

جس شخص نے حالات کا مُنہ موڑ دیا ہے

مبارک ہے رہِ ہستی میں یہ ناکامی پیہم

جو منزل دور ہو تو شوقِ منزل تیز ہوتا ہے

مندرجہ بالا اشعار اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ عرشؔ ایک فلاسفر بھی ہیں بلکہ بہ صورت اُن کے اور کئی اشعار میں بھی ہے۔ اب کچھ ایسے اشعار بھی گوش گزار ہیں جنہیں پڑھ کر یہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف عرشؔ ہی کہہ سکتے ہیں۔

مطلعِ انوار تھی اُن کی نظر

مسکراہٹ مطلعِ ثانی ہوئی

اہلِ دُنیا نے توجہ تک نہ کی اس پر مگر

کہنے والے دردِ دل کی داستاں کہتے رہے

ہے یہ ازل سے خالقِ نغماتِ زندگی

دل کے شکستہ ساز پر قربان جایئے

آپ کو تلخیٔ آلام کا احساس کہاں

آپ نے کی ہی نہیں عمر بسر کانٹوں پر

آپ ہوں گے تو مصائب میں بھی رہ کر ساتھ ساتھ

مسکرا کر کاٹ لیں گے شامِ غم آجایئے

غم کو اے ناداں حقارت سے نہ دیکھ

راس آجائے تو یہ اکسیر ہے

جائیے مجھ کو میرے جوشِ جنوں پر چھوڑیئے

آپ کیا لیں گے اُلجھ کر ایک دیوانے کے ساتھ

دریائے زندگی میں تلاطُم کے باوجود

کشتی گئی ہے جانبِ ساحل کبھی کبھی

اہلِ غم زیست کی راہوں میں عبث رُک سے گئے

زندگی اصل میں رفتار ہے زنجیر نہیں

شکستہ ہوکے جامِ مے ہوا ہے ننگِ مے خانہ

مگر پیمانہ دل کا ٹوٹ کر بھی میرے کام آیا

اہلِ جہاں نے غم تو دیئے تھے ہزار عرشؔ

کوئی شریکِ غم نہ ہوا پھر بھی ہم جیے

لاکھ دل کش ہو مگر صورت کے ہم قائل نہیں

عرشؔ اپنا یہ عقیدہ ہے کہ سیرت دیکھئے

جن گناہوں سے نہیں ہے دُور کا بھی واسطہ

مل رہی ہے اُن گناہوں کی سزا کیا کیجئے

ہم بھی کس دور سے وابستہ ہوئے ہیں اے عرشؔ
لوگ جس دور میں پتّھر کو خُدا کہتے ہیں

عمر ساری تو اسی ایک کشاکش میں کٹی
کاش! ایسا، کبھی ایسا، کبھی ایسا ہوتا

ان اشعار کا اندازِ بیاں بھی کتنا خوب ہے۔

انہوں نے مُسکرا کر بات کا رُخ ہی بدل ڈالا
کبھی جب اُن کے حُسنِ دل ستاں تک بات آ پہنچی

بحرِ حیات میں اُسے ساحل ہوا نصیب
کشتی جو بے نیازِ تلاطم گزر گئی

ساقی کی نگاہیں جھک سی گئیں کچھ تھم سا گیا رقصِ ساغر
کہتے ہیں کہ محفل میں جب بھی مُجھ تشنہ دہن کی بات چلی

آپ کرتے ہیں مری تلخ نوائی کا گلہ
یہ بھی پوچھا ہے دلِ زار پہ کیا گزری ہے

چند آنسو، چند آہیں ساتھ کُچھ مجبوریاں
اور اپنی داستاں کو مختصر کیا کیجئے

ضرورت تو اس بات کی تھی کہ بجائے چیدہ چیدہ اشعار درج کرنیکے عرشؔ صاحب

کی تمام غزلیں نقل کی جاتیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے اسی پر اکتفا کیا جارہا ہے

صلیب

آیئے ان کے تیسرے مجموعہ کلام کا جائیزہ لیں جو ''صلیب'' کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ یہ مجموعہ خاصا مقبول ہُوا۔ اس میں فنّی اور معنوی طور پر پہلے کی نسبت زیادہ پختگی ہے۔ کلام میں گہرائی بھی ہے اور وُسعت بھی۔ اس میں زندگی کی مختلف کیفیات کی ترجمانی ہے۔ اگر ایک طرف قہقہے ہیں تو دُوسری طرف طنز کے تیر۔ زندگی کے حقائق کو نہایت دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بے باکی اور حق گوئی جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اس شعر کا انداز دیکھئے ؎

عرشؔ بے باکی وحق گوئی ہے مذہب اپنا
ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح

ایک اور شعر پیشِ خدمت ہے ؎

ان سخت مراحل سے گزرنا نہیں آساں
بے باکی وحق گوئی بھی اک کوہ کنی ہے

عرشؔ خود بھی عزم وحوصلہ رکھتے ہیں اور وہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں ؎

عزم سے ہوتے ہیں حل سب مسئلے
عزم سے کٹتی ہیں زنجیریں کئی

موصوف تقدیر کی نسبت عزم و حوصلہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ؎

جن کی رگ رگ میں رواں ہو جذبۂ عزم و عمل
موڑ دیتے ہیں وہی رُخ گردشِ تقدیر کا

عرشؔ کے کلام میں کئی رنگ سے کشمیر کا ذکر ہُوا ہے۔ دیکھئے کتنے راحت خیز اشعار ہیں، جن میں حُسن بھی ہے اور نزاکت بھی ؎

روح کو اک تازگی ملتی ہے اُن کی یاد سے
وادئ کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں کی طرح

اس شعر میں جھیل ڈل کا منظر کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

کسی کی یاد ہم آغوش ہے جذبات سے ایسے
کہ جیسے جھیل ڈل کے دل میں ہلچل ہو شکاروں سے

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر جگہ ادب پر سیاست بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں کئی برسوں سے چلا آرہا ہے ۔عرشؔ بھی اس سیاست کا شکار رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ اُن کی خدمات صرف ریاستی سطح پر ہی نمایاں نہیں بلکہ ملکی سطح پر بھی ہیں ۔اس کا اظہار وہ اس شعر میں کرتے ہیں ؎

کور ذوقی بن گئی اے عرشؔ صدرِ انجمن
قدرِ شاعر ہو گئی عنقا مرے کشمیر میں

ہم نے ایک جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ

عرشؔ ایک فلاسفر بھی ہیں اس شعر کی وجہ سے یہ جذبہ پھر اُبھرا ہے ۔

طے کر چکا جو ترکِ تمنّا کے مرحلے
اُس بے نیاز کے لیے کیا راکھ کیا لباس

ملازمت کے دوران اُنہیں چند ماہ کے لئے جودھ پور (راجستھان) بھی جانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کی اُن کے دل میں گھر کی یاد بُری طرح آئی ہوگی۔ دیکھیئے اس کا اظہار کس طرح کیا گیا ہے۔ جو شدّت ان کے جذبے میں تھی وہی اس شعر میں موجود ہے ۔

دشتِ غربت میں جو آئی ہے کبھی یادِ وطن
پھوٹ کے روئے ہیں ہم پاؤں کے چھالوں کی طرح

''صلیب'' میں شامل کسی غزل پر بھی نظر ڈالیں اس کے تمام اشعار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن ان سب کا حوالہ دینا ناممکن ہے لیجیئے چند اشعار حاضر ہیں ۔

اِس طرح دِل مطمئیّن ہے اشک افشانی کے بعد
اک سکوتِ بیکراں ہو جیسے طغیانی کے بعد

ہزاروں سال دہراتی ہے دُنیا جس کے افسانے
وہ خود انساں نہیں انسان کا کردار ہوتا ہے

بگڑی ہوئی سماج کی صورت ہے اس طرح
جیسے کِسی چِتا میں کوئی ادھ جلا بدن

جیسے کسی وادی میں پَو پھٹنے کا منظر ہو

یوں رنگ تمنّا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

اُن کے اشعار میں استعمال کی گئی بعض تشبیہیں دل کو بے حد مسحور کرتی ہیں

اور پھر اندازِ بیاں بھی دل کو چھوتا ہے ۔

تمنّا کوئی جب دِل سے ہوئی رخصت، لگا ایسے

کسی مجبور کی ڈولی اُٹھائی ہو کہاروں نے

یہ روش بھی قابلِ توجہ ہے ۔

چلتے ہیں ذراہٹ کے زمانے کی روش سے

یہ ٹھیک کہا آپ نے دیوانے ہیں ہم لوگ

عرشؔ آج کے حالات کا بیان کس خوبصورتی سے کرتے ہیں ۔

جس میں خلوص ہے نہ محبّت نہ زندگی

تعمیر کر رہا ہے بشر اک نیا سماج

میخانے کی عظمت کا اظہار اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے ۔

امتیازِ مذہب و ملّت جہاں پیدا ہوا

اُس جگہ سے ہوگئی ہے راہِ میخانہ الگ

اِس شعر کے ساتھ ہم آگے بڑھتے ہیں ۔

ایک مرکز پر سمٹ آئی ہے ساری کائنات
یہ گماں ہوتا ہے بس دُنیا میں تنہا آپ ہیں

نظمیں اور قطعات

پہلے حصہ میں نظمیں ہیں جبکہ دوسرا حصّہ قطعات پر مشتمل ہے، یہ مجموعہ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' عرشؔ صہبائی کا چوتھا مجموعہ ہے اس مجموعے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ مجموعہ پہلے مجموعوں سے مختلف ہے۔ اگرچہ عرشؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اِن کا زیادہ شعری سرمایہ غزلوں پر مشتمل ہے لیکن دوسری اصنافِ سخن پر بھی وہ کافی مضبوط گرفت رکھتے ہیں، نظمیں اور قطعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اِس صنف کے اصولوں اور ظابطوں سے بھی بخوبی واقف ہیں، زبان پر مکمل عبور حاصل ہونے کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کو بڑے دِل کش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مجموعہ کا نام ایک نظم کے عنوان کی وجہ سے ہے، اِس نظم میں اُنہوں نے جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی عکاسّی کی ہے، اُن کی زندگی جس گھُٹن میں گزرتی ہے اُس کا بڑے موثر طریقے سے بیان ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ طنز عرشؔ کا موضوع نہیں لیکن جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ اِس سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کی ہر نظم دِل میں اُتر جاتی ہے۔ اندازِ بیان کے علاوہ اُن کا تمام کلام حقائق پر مبنی ہے۔ اِس مجموعے میں قطعات کے علاوہ جو نظمیں ہیں وہ ان عنوانات کے تحت

ہیں:۔

''کھوکھلے جسم بے تاب رُوحیں''۔ یہ نظم کنسر کے مریضوں سے متعلق ہے ۔''سقراط'' ایک ایسی نظم ہے جو اُردو شاعری میں اضافہ ہے۔اس طرح ''نعمتِ مخصوص'' ''ایک سوال'' اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔''احساس'' دِل کو چھوتی ہوئی نظم ہے۔''وہ دو آنکھیں'' نظم کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں ''یہ جدید عہد کی اچھی نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔'' ''الیکشن نامہ'' ایک طنزیہ نظم ہے جو اس دَور کے سیاسی رہنماؤں پر کہی گئی ہے۔''وراثت'' کشمیر کے ماحول پر کہی گئی ایک پُر اثر نظم ہے۔جو حبِ وطن کے جذبہ سے سرشار ہے اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرشؔ وطن سے کتنی محبت کرتے ہیں۔اسی طرح ''نہیں ایسا نہیں ہوگا'' جموں کے ۱۳ جنوری ۱۹۸۹ء کے ایک واقع سے متاثر ہو کر کہی گئی بے حد کامیاب نظم ہے۔اِسی طرح ''ادائے سلام'' ایک مختصر اور خوبصورت نظم ہے یہ بے حد مقبول ہو چکی ہے۔پہلے ہم چند قطعات پیش کریں گے ملاحظہ فرمائیں۔

تلخ ہوتا ہے جامِ غم لیکن
پینے والے اِسے بھی پیتے ہیں
ہم نے سیکھا ہے یہ محبت میں
دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں

بہرِ پُرسش اگر چلے آتے
اس بہانے سے دید ہو جاتی
آپ کا اس میں کیا بگڑ جاتا
ہم غریبوں کی عید ہو جاتی

اُن کے دم سے ہیں رونقیں ساری
ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے
غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں
اک نہ اک حادثہ ضروری ہے

ناز ہے جس پر آدمیت کو
گوہرِ بے نظیر بِکتا ہے
چند سکّوں کے واسطے اے عرشؔ
آدمی کا ضمیر بِکتا ہے

بے بسوں اور بے سہاروں پر
ستمِ بے پناہ کرتا ہے
اقتدار و وقار کی خاطر
آدمی ہر گناہ کرتا ہے

بارہا تھک کے گر پڑی ہے عرش
زندگی آفتوں کی جھولی میں
جیسے مجبور سی کوئی دُلہن
بے دلی سے رواں ہو ڈولی میں

پوری نظم نقل کرنا ممکن نہیں لیکن ہم ''نعمتِ مخصوص'' کا یہ بند ضرور پیش کرنا چاہیں گے۔ مُلک میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں جہاں جاہل اور ان پڑھ لوگ وزیروں کے عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بند ہی پوری نظم ہے ۔

ہر چیز پہ غالب ہیں جو ہیں جاہل و نادار
جو عاقل و دانا ہیں تذبذب میں پڑے ہیں
وہ رنگ دکھایا ہے سیاست نے وطن میں
ہم آج تباہی کے دہانے پہ کھڑے ہیں

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں اُن لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جو زندگی میں زندہ نہیں رہتے بلکہ رینگتے ہیں۔ چونکہ عرش مثبت نظریہ کے حامی ہیں اس لئے ان تمام حقائق کے باوجود وہ مایوس نہیں۔ نظم کا آخری بند ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے ۔

کہیں کہیں کوئی آوازِ حق اُبھرتی ہے
کہیں کہیں کوئی مدھم چراغ جلتا ہے
مری نگاہ میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں عرشؔ
یہ وہ جگہ ہے جہاں انقلاب پلتا ہے

طوالت کو دیکھتے ہوئے ہم اس مجموعہ سے صرف ''سقراط'' نظم پیش کرتے ہیں جو اُردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے اور اُردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت کی حامل ہے۔

''سقراط''

میں ہوں اس دَور کا سقراط مُجھے قتل کرو
زہر کا کوئی اثر مجھ پہ نہیں ہوسکتا
رنج اُٹھاتا ہوں میں اظہارِ حقیقت کے لئے
میرے سینے میں ہیں رِستے ہوئے زخموں کے نشاں
زخم بھی وہ کہ جنہیں دیکھ کے صرف ایک نظر
دل کا مذکور ہی کیا، روح لرز جاتی ہے
میرے احساس پہ ہیں غم کی خراشیں کِتنی
میری گفتار پہ ہیں ضبط کے پہرے کب سے
میرے ماحول کی ہیں دین یہ نادر تحفے
مہرباں مُجھ پہ عجب رنگ سے ہے میرا سماج

لیکن اس پر بھی جو کہتا ہے مُجھے میرا ضمیر

بے دھڑک ہو کے سرِ بزم وہ کہہ دیتا ہوں

جانتا ہوں کہ سزا اس کی کڑی ہوتی ہے

کم سے کم اس میں دل و جاں کا زیاں ہوتا ہے

اپنی فطرت سے مگر بے بس و مجبور ہوں میں

غیر ممکن ہے کہ حق گوئی سے ہو مجھ کو گُریز

ہم نَوا جب کوئی ملتا نہیں دُنیا میں مُجھے

بے طرح ایسے میں ڈستا ہے مُجھے میرا ضمیر

مصلحت چیز ہے کیا اور خُوشامد کیا ہے

ایسے الفاظ کا مفہوم نہیں مُجھ پہ عیاں

ایسے رستوں سے کبھی ہوتا نہیں میرا گزر

منزلِ دار و رسن ہے مُجھے مرغوب بُہت

ہم سفر اور کوئی اس میں کہاں ملتا ہے

لُطف دے جاتی ہے کُچھ تنہا خرامی مجھ کو

میری آنکھوں میں عجب نشّہ عجب مستی ہے

میری رگ رگ میں ہے زہرآبِ الم کی مستی

میں ترس جاتا ہوں اے کاش کوئی مُجھ کو مِلے
دَبے الفاظ میں اس بات کی تصدیق کرے
آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی
آج کے دَور کا سقراط ابھی زندہ ہے

اس کے علاوہ اس مجموعہ میں سانیٹ بھی موجود ہیں۔ جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں ''دل'' اور ''یاد'' کے عنوان سے دو عدد اور آخر میں ایک نظم ''غزلخواں آنکھیں'' شامل ہے۔ ''یہ تری مست وسیہ فام غزل خواں آنکھیں''۔ دوسری نظموں کی طرح یہ نظم بھی بے حد جاذبِ نظر ہی نہیں قابلِ ستائش بھی ہے۔

بقول عبدالقادر سروریؔ ''عرشؔ نے سانیٹ کی صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور قدرتِ اظہار نے اس کو بھی اچّھا نمونہ بنا دیا ہے۔''

اسلوب

'اسلوب' عرشؔ صہبائی کا پانچواں مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۹۱ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ ریاست کی کلچرل اکادمی نے اسے ۵۰۰۰ روپیٔے کے انعام سے نوازا تھا۔ اس مجموعہ میں صرف غزلیات ہیں۔ جو زیادہ صاف اور پُر کشش ہیں۔ چھوٹی بحروں میں عرشؔ صاحب کو عبور حاصل ہے لیکن موصوف لمبی بحروں میں دل کشی اور تاثیر پیدا کرنے میں کامیاب نظرؔ تے ہیں۔ ہیں۔ بہ الفاظِ دگر وہ چھوٹی اور بڑی

بحروں میں خوبصورت اشعار کہنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ چند اشعار گوش گزار ہوں ۔

ہزاروں سازشیں پنہاں ہیں اُن کے اک تبسُّم میں
اُنہیں پھر بھی یہ ضد ہے وہ ہمارے مہرباں ٹھہرے

رستے میں چٹانیں ہوں لیکن اک موجِ رواں کو کیا مطلب
ہم اس سے بھی ٹکرا جائیں گے دُنیا غم کی دیوار چُنے

پھُولوں سے کنارہ کش ہو کر دامن میں ہزاروں خار چُنے
ہم لوگ بھی کیا دیوانے ہیں جینے کے لئے آزار چُنے

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عرشؔ صاحب کی شاعری کا محور زندگی ہے۔ وہ زندگی کو اپنا محبوب مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ زندگی ہی کی طرح اس میں تسلسل اور روانی ہے۔ وہ ادب برائے ادب کے نہیں ، ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر جاویدؔ وششٹ نے اپنے ایک مضمون ''معنیِ حیات'' میں عرش صہبائی کے مُتعلق برحق لکھا ہے'' عرش صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اُن کی غزل میں آ کر زندگی خُود غزل بن جاتی ہے'' زندگی کے بارے میں اُن کا ذاتی مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ اُنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اپنے اشعار میں وہ زندگی کے کئی پہلو اُجاگر کرتے ہیں۔ ۔

کسی بھی زاویے سے عرشؔ اس کو دیکھئے مگر
قدم قدم پہ زندگی ہے امتحاں لئے ہوئے

زندگی گزری ہے میری مسئلوں کے درمیاں
زندگی کے مسئلے میری طرح سمجھے گا کون

زندگی تو عمر بر برہم رہی لیکن تجھے
جس طرح چاہا ہے ہم نے اس طرح چاہے گا کون

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر تھا اپنا
زندگی رہ گئی اک آگ کا دریا بن کر

زندگی کیا ہے یہ پوچھے کوئی ہم سے اے عرشؔ
تیر کے آئے ہیں ہم آگ کے دریا کتنے

یہی نہیں عرشؔ کی نظر میں حادثات زندگی کی دولت ہیں اور زندگی کے لئے ضروری بھی۔

حادثوں سے ہے متاعِ زندگی کی آبرو
زندگی کھاتی ہے کس کس موڑ پر ٹھوکر نہ دیکھ

عرشؔ زندگی کی صحت مند قدروں کے دیوانے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ آج کے دور میں خلوص اور محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔ اور وہ لوگ جو اِن خوبیوں کے حامل ہیں، مختلف مصائب کا شکار ہیں۔ بلکہ اخلاق پسندی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ وہ خود حقیقت پسند ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز کو زندہ رکھ کر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ آپ کو ان اشعار میں مختلف نوعیت کی قدروں کا احساس ہوگا

جو انسان کے لئے بے حد ضروری ہیں

اور ہی کچھ رنگ لائی ہے نئی تہذیب عرشؔ
ورنہ اخلاص و وفا کے پیڑ بے سایہ نہ تھے

اخلاص بنا دے گا ہمیں اپنا ہی دُشمن
کیا علم تھا بے جُرم سزائیں بھی ملیں گی

ہم ترستے ہیں کوئی صاحبِ کردار ملے
یوں تو ہر گام پہ ہیں صاحبِ گفتار بہت

ہر اک شے سے برتر ہے تیرا ضمیر
اگر یہ ترے پاسبانوں میں ہے

میں کبھی منصور کی صُورت کبھی سقراط ہوں
حق پرستی نے کیا دُنیا میں لافانی مُجھے

اُسلوب میں شامل غزلوں کے بعض اشعار میں عرشؔ نے ہندی الفاظ کو بھی زیرِ استعمال لایا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اُردو زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اُردو شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے لیکن عرشؔ کا کمال یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے ہندی کے الفاظ کو اُردو لہجہ عطا کیا ہے جس سے وہ غیر مانوس نہیں لگتے۔ بلکہ یہ فطری معلوم ہوتے ہیں یہی نہیں اُن سے اشعار میں سلاست اور روانی برقرار رہتی ہے۔ اس بات کی تصدیق

ان اشعار سے ہوتی ہے۔

اپنے وطن سے عرشؔ بہت دور لے گیا
کس سے کہیں یہ وقت کا کیسا بہاو تھا

ہم مسافر ہیں نکل جائیں گے ہر بستی سے دور
اور ہم کو ڈھونڈتی پروائیاں رہ جائیں گی

یہ زندگی کا مدھوبن ہے اس کو کیا کہیے
کہیں ہیں یاس کے کانٹے کہیں ہیں آس کے پھول

ہم زندگی کی ناؤ کو کھیتے تو کس طرح
دریائے حادثات کا اُلٹا بہاؤ تھا

پھر اس کے بعد مِل نہ سکا ہم سفر کوئی
یہ زندگی کی راہ میں کیسا پڑاؤ تھا

ریزہ ریزہ وجود

"ریزہ ریزہ وجود" عرشؔ صہبائی کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ فروری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ سب سے پہلے اس بات کی داد دینا پڑے گی کہ موصوف نے کس خوبی کے ساتھ مجموعے کے عنوان کو شعر میں ڈھالا ہے۔ شعر دیکھئے

کتنے رنگین خواب بُنتا ہوں ریزہ ریزہ وجود چُنتا ہوں

عرشؔ کا اندازِ بیاں پُر اثر ہے۔ وہ تشبیہ اور استعارات بہت کم استعمال کرتے ہیں لیکن جب ان کا استعمال ہو تو اُس میں جدّت اور ندرت کا پہلو ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر استعمال ہونے والے مضامین کو بھی اپنے انداز و اسلوب سے بالکل نیا اور اچھوتا بنا دیتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

دل کہ تھا آرزوؤں کا مسکن
خونِ حسرت میں تر بہ تر دیکھا

سب کا ہوں مگر کوئی بھی اپنائے نہ مجھ کو
میں بھی کسی ٹوٹے ہوئے رشتے کی طرح ہوں

میں ڈوبنے والوں کا بھی بنتا ہوں سہارا
تسلیم یہ مجھ کو کہ میں تنکے کی طرح ہوں

عرشؔ جدید موضوعات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا مطالعہ حیات و کائنات اور مشاہدۂ فطرت بڑا گہرا ہے۔ شرؔر فتح پوری نے برحق کہا ہے "اِس دور میں آپ غزل کی آبرو ہیں اور اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار" عرشؔ زندگی کے حقائق کو کسی لمحہ بھی فراموش نہیں کرتے۔ وہ اخلاقی قدروں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے ؎

اخلاق کے بدن سے نہ مجھ کو اُتارئے
تہذیبِ زندگی کا پُرانا لباس ہوں

موصوف ایک مُخلص اور ایماندار شخص ہیں اس لئے زندگی میں جو کچھ

محسوس کرتے ہیں اُس کے اظہار سے کبھی گُریز نہیں کرتے۔ اس ضمن میں اُن کا یہ شعر دیکھئے ؎

اے عرشؔ بن سکا نہ کبھی مَیں زمانہ ساز
اتنا ضرور ہے کہ زمانہ شناس ہوں

وہ زندگی سے ٹوٹ کر محبّت کرتے ہیں۔ کیونکہ زندگی اُن کی محبوب ہے۔

اس کا اظہار اُن کے کئی اشعار میں ہے۔ مثلاً

اُنہیں عزیز ہے پھر بھی جو اس کے شیدا ہیں
چلو حیات شکستہ سا اک مزار سہی

یہ حقیقت ہے کہ قُدرت اپنے راز کبھی افشا نہیں کرتی لیکن یہ صرف شاعر کی ذات ہے جس پر یہ راز افشا ہوتے ہیں۔ لیکن شاعر ذمّہ داری کے ساتھ یہ بات محسوس کرتا ہے کہ اُسے اس راز کا اظہار دوسروں پر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا اعتراف اس شعر میں کرتے ہیں ؎

یہی تقاضائے قُدرت ہے چُپ رہوں میں عرشؔ
ہر ایک راز مرے دل پہ آشکار سہی

ریاست جموں وکشمیر گزشتہ کئی برسوں سے جن حالات سے دوچار ہے اور اہلِ ریاست جن غیر موافق حالات کا شکار ہیں عرشؔ کو اس کا پُورا پُورا احساس ہے۔ دیکھئے وہ کس جرات اور بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں یہ

بات بھی دادطلب ہے کہ موصوف غیر موافق حالات کے باوجود مستقبل سے قطعاً مایوس نہیں اس ضمن میں یہ شعر قابلِ توجہ ہے۔

وحشت کا جو طوفان اُمنڈ آیا ہے ہر سو
اس سیلِ رواں کا کہیں ٹھہراؤ تو ہوگا

عرشؔ کے دل میں محبوب کے لئے جو مقام ہے اُس کی کہاں تک تعریف ہو۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن پر بے پناہ ستم توڑتا ہے

میں تو پلکوں پر بٹھاؤں گا تُمہیں
تُم مرے سینے پہ پتھر توڑنا

یہ شعر بھی دیکھئے۔ کیا خوب ہے

یہی کہ جورِ مُسلسل سے دل یہ ٹوٹ گیا
ذرا سی بات کی خاطر تو شرمسار نہ ہو

یہ دُنیا فنا آمادہ ہے۔ اس نازک مسلّے کو عرشؔ صاحب نے جس طریقہ سے بیان کیا ہے یہ اُنہیں کا حصّہ ہے

کلی جو پھول بنی ، بے طرح بکھر سی گئی
اسے کہا تھا تبسّم سے ہم کنار نہ ہو

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عرشؔ کے کلام میں رجائیت

جا بہ جا جلوہ گر ہے۔ وہ ہر حال میں روشن مستقبل کو نظر میں رکھتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر دیکھئے

جن کو ہے پرواز کی دُھن وہ کبھی رُکتے نہیں
پُرکشش ہے کس قدر دانہ و دام اپنی جگہ

عرشؔ کی نظر میں رنج و غم اور حادثات متاعِ حیات ہیں ان کی بدولت انسان زندگی کرنا سیکھتا ہے۔ دیکھئے وہ کس انداز سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی عظمت کا اعتراف بھی مرتے ہیں

ہم کہ ان دونوں کی عظمت سے کبھی منکر نہیں
راحتیں اپنی جگہ غم کا مقام اپنی جگہ

تمام زندگی کانٹوں کے درمیاں گزری
خُدا کا شکر میں شرمندۂ بہار نہ تھا

ہم اپنی زندگی میں جن کا ذکر کر سکتے
کوئی بھی واقعہ اس درجہ خوشگوار نہ تھا

کبھی ہم ایسے مقامات سے بھی گزرے ہیں
ہزار غم تھے مگر کوئی غم گسار نہ تھا

عرشؔ نے تصوّف کے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں کیا مقام دیا ہے اور کس رنگ میں انہیں بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

عجیب سلسلہ ہوگا سکوت کا اُس وقت
نہیں تھا کچھ بھی زمانے میں جب خُدا کے سوا

جئیں ہم اُس کی خُوشی تو مریں ہم اُس کی خُوشی
یہ کیا کہ ہم کو کسی شے پہ اختیار نہیں

اس مجموعہ پر عرشؔ صاحب کو ۱۰ ہزار روپے کا انعام بھی مل چُکا ہے۔

اساس

"اساس" عرشؔ صہبائی کا ساتواں مجموعہ کلام ہے یہ مجموعہ صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ اسے یقیناً عرشؔ کے نمائندہ مجموعوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں عرشؔ کا فن اپنے عروج پر ہے۔ عرشؔ کا شمار اُن شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی زندگی ادب کی خدمت کے لئے وقف ہے اس حوالے سے اُن کا یہ مقطع قابلِ توجّہ ہے۔

شاعری مجھ کو نہ کیوں کر ہو دل و جاں سے عزیز
عرشؔ یہ نصف صدی کی ہے عبادت میری

عرشؔ صہبائی کی شاعری قُدرتی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا کلام کہنے کے باوجود اُن کے اشعار میں کسی خیال کی تکرار نہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے ورنہ جب کسی شاعر کے ایک دو مجموعے شائع ہو جائیں تو وہ اپنے اشعار میں خیالات

اور موضوعات کو دہرانا شروع کر دیتا ہے

بعض اوقات اُس کی شعر کہنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ عرشؔ زندگی کو کیفیات اور احساسات کو تسلیم کرتے ہیں۔ دوسروں الفاظ میں زندگی کی بُنیاد رنج وغم اور خوشی ہے۔ اس تصوّر کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندی نہیں جس میں بھنور نہیں

مزید برآں وہ فرماتے ہیں ؎

زندگی ایک مرقع ہے غم وراحت کا
خار وگُل دونوں سے تزئینِ چمن ہوتی ہے

عرشؔ کی شخصیت ایک آئینے کی طرح ہے۔ پاک اور شفاف اور یہی خوبی اُن کے کلام میں بھی عکس ریز ہے۔ وہ جس صنف میں بھی شعر کہیں وہ تصنّع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں اسی لئے وہ قاری کے دل کو چھو لیتے ہیں۔ اس بات کی بھی تعریف کرنا پڑے گی کہ عالمی سطح پر جو واقعات ہوتے ہیں عرشؔ اُن سے بھی غافل نہیں۔ انسان آج شمس وقمر پر کمندیں ڈالنے کے درپہ ہے۔ وہ سیاروں میں بستیاں بسائے گا۔ عرشؔ اسی جذبہ کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں ؎

آباد ہمیں ہونا ہے اک روز یہیں عرشؔ
تسلیم ابھی شمس وقمر سے ہیں بہت دور

اس سے ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرشؔ غزل کے بندھے ٹکے مضامین کو نظم کرنے تک محدود نہیں۔ اُن کے خیالات میں تنوع ہے جس کا ثبوت اُن کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔ اگر چہ انسان خلا کی وسعتوں میں گامزن ہے اس کے باوجو وہ زندگی سے مُطمین نہیں۔ فنا کا احساس اُن کے ذہن ودل پر بُری طرح حاوی ہے اس حقیقت کو کسی طور بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھیئے یہ بات کس انداز سے کہی گئی ہے ؎

تیرا دعویٰ کہ خلاؤں کو کرے گا تسخیر
دسترس میں تری یہ عمرِ رواں تک بھی نہیں

آج انسان جس کرب سے گزر رہا ہے اس کا اظہار ان اشعار میں موجود ہے ؎

اِن کے چہروں سے کُچھ بھی ہو ظاہر
لوگ اندر سے زخم خوردہ ہیں

نہ آئینوں میں کوئی شکل تک اُبھرتی تھی
تمام شہر ہی لپٹا ہوا غبار میں تھا

میں ہوں کس حال میں کیوں کر مجھے معلوم ہو عرشؔ
ایک مدّت سے میری خُود سے ملاقات نہیں

آج کی نئی تہذیب نے بہت حد تک اُن پُرانی قدروں کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے جو ہماری زندگی کا ورثہ تھیں۔ عرشؔ نے اسے شدّت کے ساتھ محسوس کیا

ہے۔وہ فرماتے ہیں ؎

بشر کو آج کی تہذیب پر ہے ناز بہت
ہیں اس عروج میں پنہاں مگر زوال کئی

ضرورت تو اس بات کی ہے کہ عرشؔ کی تمام غزلیں پیش کی جائیں۔ان میں شامل کوئی بھی ایسا شعر نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے کیوں کہ اُن کا ہر شعر کوئی نہ کوئی نیا پہلو لئے ہوئے ہے لیکن ایسا ممکن نہیں۔

ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو عرشؔ صاحب کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے۔اس طرح ہم تذبذب کے ایک عجیب عالم میں مُبتلا ہیں۔عرشؔ کی اپنی زندگی رنج والم کا مرقع رہی ہے۔اس کا اشارہ اُن کے ان اشعار میں موجود ہے ؎

تو نے رنگین بہاروں سے نوازا سب کو
مرے حصّے میں مگر بادِ خزاں تک بھی نہیں

ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہم راحتوں کے سلسلے
زندگی میں ہر قدم پر غم کی زنجیریں ملیں

اگرچہ عرشؔ کی زندگی آلام ومصائب کے درمیاں گزری ہے اس کے باوجود اُنہیں یہ بے حد عزیز ہیں۔وہ اس رشتے کو آخری سانس تک نبھانا چاہتے ہیں ۔

رشتہ جو مصائب سے ہے توڑا نہیں جاتا

اس ناؤ کو منجدھار میں چھوڑا نہیں جاتا

یہ شعر دیکھئے کیا خوب کہا ہے ۔

ان سے بڑھتے ہیں دلوں کے حوصلے

ہر قدم پر حادثے ملتے رہیں

جب چلے جھونکے غمِ ایام کے

ساتھ اپنے حوصلے لائے بہت

اس کے باوجود وہ دِل شکن نہیں ہوتے بلکہ فرماتے ہیں ۔

لوگ ترسا کئے مُسرّت کو

ہم غمِ زندگی کے قائل تھے

چونکہ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کی ایک محقق طالبہ نے ''اساس'' کی روشنی میں اگست ۲۰۰۳ء میں عرشؔ صہبائی پر ایم ۔فل کیا تھا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ سے زیادہ اشعار پیش کئے جائیں لیکن ایسا اس لئے ممکن نہیں کہ ابھی اور بھی کئی مجموعوں سے انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہے اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''اساس'' کے انتخاب کو مختصر کیا جائے تاکہ قارین دوسرے مجموعوں کے انتخاب سے محروم نہ رہیں۔ ہم انتخاب جتنا مرضی کڑا کریں انتخاب مختصر نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ الہامی شاعری ہے۔ ایسی شاعری سے صرف

دل ہی کو نہیں بلکہ روح کو بھی تسکین حاصل ہوتی ہے اور زندہ رہنے کی تحریک حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کے وہ اسرار ہم پر کھلتے ہیں جن کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیجئے چند اشعار حاضرِ خدمت ہیں، ملاحظہ فرمائیے

جینے کی خاطر غم لازم ہوتے ہیں
یہ کشتی طوفاں کے سہارے چلتی ہے

راحتیں ابرِ رواں بن کر بکھر جائیں گی عرشؔ
زندگی کی ہر حقیقت غم کے پسِ منظر میں دیکھ

راحتوں کی دُعائیں کیا مانگوں
راحتیں غم سے معتبر بھی نہیں

عرشؔ جن کا کوئی ضمیر نہیں
ایسے لوگوں کا یہ زمانہ ہے

اُن لوگوں میں تم بوئے وفا ڈھونڈ رہے ہو
جو لوگ یہاں کاغذی پھُولوں کی طرح ہیں

حق پرستی نے بھی کیا حوصلہ بخشا مجھ کو
جان سولی پہ مگر لب پہ فغاں تک بھی نہیں

اُن کو دعویٰ ہے حق پرستی کا
عرشؔ جن کے ضمیر مُردہ ہیں

دیر و کعبہ سے مناسب ہے کنارہ کرلیں
یہ تفرقاتِ من و تُو نہیں دیکھے جاتے ہے

ہے فیض یہ قدرت کا اُس شخص کی باتوں میں
گنگا کا تقدس بھی جمنا کی روانی بھی

سفر طویل، کڑی دھوپ، پاؤں میں چھالے
پھر اُس پہ حدِ نظر تک کوئی شجر بھی نہیں

ہم نے اے عرشؔ غزل کو نیا آہنگ دیا
باوجود اس کے کہ ہم اہلِ زباں تک بھی نہیں

جنابِ عرشؔ کی باتوں کو کیسے جھٹلائیں
وہ معتبر نہ سہی غیر معتبر بھی نہیں

یہ پھیل جاتی ہیں جنگل میں آگ کی صورت
اگرچہ کہنے کو باتوں کے پَر نہیں ہوتے

جانتے ہیں ہم کہ اِن پاؤں میں زنجیریں بھی ہیں
ہم وہ رہ رَو ہیں کہ جن کے ساتھ تدبیریں بھی ہیں

اُردو دوہے

"تجھ بن چین کہاں" یہ عرشؔ صہبائی کے اُردو دوہوں کا مجموعہ ہے جو زیرِ اشاعت ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عرشؔ اُردو

شاعری کی جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں وہ اُسے عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔
یہی بات اُن کے اُردو دوہوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے
کہ وہ جدید شاعری کے سخت مخالف ہیں اور اُن کا اپنا کلام جدّت سے لبریز ہے۔ اس
کے یہ معنی بھی ہوئے کہ جو شعراُ خود کو جدید کہتے ہیں، وہ جدّت کے مفہوم سے واقف
نہیں۔ عرشؔ صاحب کے اُردو دوہے جدید بھی ہیں اور دوہوں کی دُنیا میں اضافہ بھی۔
دوہوں میں ایسے ایسے مضمون ملیں گے جو بہت کم ذہن میں آتے ہیں۔ اس پر اندازِ بیاں
عرشؔ کا اپنا ہے جو منفرد ہے۔ اُن کے اُردو دوہوں میں ایک اہم بات یہ ملے گی کہ ان
میں غزلیت ہے۔ قارین کے ذہن میں جو دوہے ہیں۔ یہ دوہے اُن سے یکسر الگ ہیں
۔ صرف اُردو کے نمایاں جرائد ہی میں نہیں، ہندی کے اہم پرچوں میں بھی یہ شائع ہو کر
بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ تمام باتوں کو چھوڑ کر آپ کی خدمت میں کُچھ اُردو دوہے پیش
کیئے جاتے ہیں تا کہ آپ اپنی رائے بھی قائم کر سکیں، ملاحظہ فرمائیے۔

۱

افشاں ہو گا راز یہ جب ہوگی تحقیق
میں اُس کی تخلیق ہوں یا وہ مری تخلیق

۲

پہلے وہ ناراض تھا اب ہے دل سے دُور
چھوٹے چھوٹے زخم ہی بنتے ہیں ناسُور

۳

اور بھی صُوبوں میں ابھی بٹے گا ہندوستان
جگہ جگہ بے کار ہیں کئی سیاست دان

۴

گوری تنہا ہے اگر ساون ہے بے رنگ
جُھولے لاتعداد ہیں جُھولے کس کے سنگ

۵

دُنیا میں ایمان کا رہے نہ کوئی نشاں
ہر اک گھر میں چاہیے ایک سیاست دان

۶

یہ ہے نازک آئینہ اس میں آئے نہ بال
دل کا رشتہ ٹوٹ کر ہوتا نہیں بحال

۷

موت کو حاصل برتری اس کے ہاتھ نکیل
ایسے ہے یہ زندگی جیسے کوئی رکھیل

۸

ہم ہیں شبنم کی طرح جب نکلے گی دھوپ
ہوں گے اور ہی رنگ میں ہوں گے اور ہی رنگ میں

۹

ریزہ ریزہ کر گئے اُن نینوں کے بان
پھر بھی کوئی زخم ہے اور نہ کوئی نشان

۱۰

دل میں جتنے زخم ہیں بہتر ہے نہ کُرید
ان زخموں میں بند ہیں آپس کے سَو بھید

۱۱

مَن میں ہجر کی آگ ہے بھیگا ہے ہر انگ
نادانی ہے کھیلنا یوں بارش کے سنگ

۱۲

پہلے جلتی دُھوپ تھی اب ہے ٹھنڈی چھاؤں
میرے گھر کے صحن میں پڑے یہ کس کے پاؤں

۱۳

تُو نے دی ہیں مُشکلیں اور کئی آزار
اس پر بھی اے زندگی ہم ہیں شکر گزار

۱۴

پینے کو پانی نہیں بجلی کا بُحران
اس پر بھی کہتے رہو اپنا دیش مہان

۱۵

دل بھی کُشادہ چاہیے اور کُشادہ سوچ
آپ تو ہر اک بات میں کرتے ہیں سنکوچ

۱۶

آپ کے کارن ہر جگہ بڑھتی اپنی شان
اتفاق سے آئے ہیں کرلیتے جل پان

۱۷

آئے نئے لباس جو دکھلائیں کیا رنگ
ان سے عُریاں اور بھی جسم کا اک اک انگ

۱۸

افضل اِن میں کون ہے　　بحث ہے یہ درپیش
دِل مرکز جذبات کا　　عقل ہے دور اندیش

۱۹

کل تھے رونق بزم کی　　آج ہے اُن کا سوگ
کس کس سے یہ پُوچھئے　　کہاں گئے وہ لوگ

۲۰

کہنے کو عورت مگر　　قُدرت کا شہکار
ایک کھلونے کی طرح　　بِکے سَرِ بازار

۲۱

پہلے سے ہے طے شُدہ　　کون ہے کس کے سنگ
قدرت کے یہ کھیل ہیں　　قُدرت کے ہیں رنگ

۲۲

یاد آئے ہر بات وہ　　گیا ہوں جو ہیں بھول
جب بھی کسی کتاب میں　　دیکھوں سُوکھے پُھول

۲۳

یہ کیسا انداز ہے یہ کیسا دستور
میرے دل کے پاس ہو نظروں سے ہو دور

۲۴

اس پہ اثر انداز ہے مغرب کا ہر رنگ
مشرق کی تہذیب کو جیسے لگا ہو زنگ

۲۵

کاش کبھی وہ بھیجتے رسماً کوئی سلام
ہم اتنی سی بات پر بِک جاتے بے دام

۲۶

ہر لمحہ کرتے رہے حق گوئی کا جاپ
اِسی طرح ہم بن گئے اپنے دُشمن آپ

۲۷

بارش سے محروم ہو جیسے سُوکھا کھیت
وہ دریا کی موج ہے میں صحرا کی ریت

۲۸

ظاہر میں ہے دیدنی اس کی بُود و باش
ورنہ ہر انسان ہے چلتی پھرتی لاش

۲۹

آوارہ ، بے علم ہو اُس پر ہو بے پیر
جس میں ہوں یہ خوبیاں وہ بنتا ہے وزیر

۳۰

اس سے جُوی ہے روح یا جسم ہے اس کے سنگ
بھید کبھی کُھلتا نہیں قُدرت کے ہیں رنگ

۳۱

دل ہے مصائب میں گِھرا کوئی نہیں رفیق
یہ اس کی اوقات ہے یہ اُس کی توفیق

عرشؔ صہبائی کا ایک مجموعہ ’’ چشمِ نیم باز‘‘ جوزیرِ اشاعت ہے اُس سے بعض اشعار حاضرِ خدمت ہیں ۔

میں اک چراغ کی مانند جل رہا ہوں عرشؔ
مجھے یہ کون سرِ رہ گزار چھوڑ گیا

دیکھتا ہوں آج میں تنہا کھڑا ہوں راہ میں
یاد آتا ہے کہ میری زندگی میں تُو بھی تھا

اب کسی بات کی کوئی غلط فہمی نہیں
زندگی ہم نے تجھے چاہا بہت پرکھا بہت

زندگی مجھ سے کیا بسر ہوتی
زندگی نے کیا بسر مجھ کو

ہر خوشی منتقل ہوئی اُن کو
غم کی جاگیر میرے پاس رہی

اور پھیلے گی تن کی عُریانی
آگئے خوشنما لباس بہت

ایک شاعر کے سوا کون کرے گا افشا
راز جو سینۂ فطرت میں ہیں گہرے ہیں بہت

وہ اپنی یاد کا گرد و غبار چھوڑ گیا
عجیب شخص تھا کیا یادگار چھوڑ گیا

وہ مُعیّن وقت سے پہلے نہ مِل سکتا تھا عرشؔ
ورنہ میں تو مُدّتوں سے اک نہ اک پیکر میں تھا

زندگی کو اگر سمجھنا ہے
جھونپڑوں میں اِسے بسر کرنا

درویش صفّت لوگ ہیں یہ سچ ہے مگر
ہم ہیں قطرے میں سُمندر کو سمونے والے

کوئی منزل نہیں نِگاہوں میں
جیسے ایک طے شُدہ سفر ہوں میں

کیا خوب رفاقت تھی برسوں کی رفاقت بھی
ہنستے رہے ہمسائے جلتا رہا گھر اُس کا

اس میں پھولوں کی ہنسی پاؤ گے تم
جب ملے فُرصت مرا گھر دیکھنا

میرا اندازِ سخن ہی میری پہچان ہے عرشؔ
اِس قدر بھیڑ میں بھی ہے مری آواز الگ

منظر تڑپتے ہوں گے کہ دیکھے کوئی انہیں
وہ وقت جب جہان میں پیدا کوئی نہ تھا

اِس میں تُم جو نہیں تو کُچھ بھی نہیں

یوں تو آراستہ ہے گھر کِتنا

غور سے دیکھا اُسے تو وہ مرا پرتو تھا عرشؔ

مُدّتوں سے جس کو ملنے کا تھا دِل میں چاؤ سا

ہر گھڑی تُجھ کو رہا اپنی نُمائش کا خیال

کیا مرے اشعار کی گہرائیوں میں تُو نہ تھا

مُجھ کو خود پر ہے شائبہ تیرا

میں جُھکاؤں سرِ نیاز کہاں

موج ، طوفان ، آندھیاں ، گرداب

ایک کشتی کے بادباں کِتنے

جب بھی یاد آئی کِسی معصوم بچّے کی ہنسی

میرے دِل سے چھین کر ہر اک دُعا لے جائے گی

مری حیات میں صدیوں کی پیاس رہنے دو

نظر کے سامنے خالی گِلاس رہنے دو

کہیں نہ طنز کریں تُم پہ آئندہ نسلیں

فقیرِ شہر کے تن پر لباس رہنے دو

ترے قریب ہو جو خُود سے دور ہوتا ہے
عمل کا ردِّعمل بھی ضرور ہوتا ہے

آب جُو بن کے رہوں یا کوئی دریا اے عرشؔ
آخرِ کار سمندر میں اُترنا ہے مُجھے

خزاں کے دور کی ہر بات جانتا ہوں مَیں
مُجھے بتا کہ بہاروں میں کتنے باغ جلے

نہ جانے کتنے ہی صدموں سے ہمکنار تھا دل
مگر یہ آئینہ پھر بھی نہ پاش پاش ہُوا

علم وفن کے نام پر قائم اداروں کے طفیل
جو بھی اہلِ علم وفن ہے وہ نظر انداز ہے

کہیں چمن کی تباہی میں اس کا ہاتھ نہ ہو
چمن سے بچ کے گزرتی ہے اب صَبا کتنی

اور نمایاں ہوتے ہیں کُچھ مِٹ کر ہم
ہم وہ پھول ہیں جو مُرجھا کر کھلتے ہیں

چمن جلاؤ خوشی سے مگر یہ یاد رہے
چمن جلے تو کئی آشیاں بھی جلتے ہیں

خُودکشی سب سے بڑا جُرم سہی دُنیا میں
خُودکشی کا بھی مگر کوئی سبب ہوتا ہے

کسی بھی سوچ میں شک کا کوئی شگاف نہ تھا
میرے یقیں پہ کبھی وہم کا غلاف نہ تھا

جو بھی فرسودہ رواجوں سے جُدا رہتا ہے
زندگی سے وہ بہر طور کٹا رہتا ہے

یہ انتظار کا موسم بھی ہے عجب موسم
تمام زندگی اک رَت جگا سا رہتا ہے

اے اہلِ سیاست تمہیں معلوم تو ہوگا
حالات میں کچھ دیر سے اُلجھاؤ سا کیا ہے

میں ایک فسانہ بلاعُنوان ہُوں کب سے
لے کر کوئی عُنوان فسانے کے لئے آ

جینے والے اُن حالات میں جیتے ہیں
جن میں جینے کی صُورت کم ہوتی ہے

زخم چھلیں تو اور مزا دیتے ہیں عرشؔ
نشتر میں بھی صُورتِ مرہم ہوتی ہے

توازن

عرشؔ صہبائی کا ایک مجموعہ کلام ''توازن'' کے نام سے زیرِ اشاعت ہے اس میں سے چند اشعار حاضر ہیں۔ اُن اشعار سے بھی زندگی کا ہر پہلو اُجاگر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

لوگ جو با ضمیر ہوتے ہیں
مشکلوں کے اسیر ہوتے ہیں

ہم تو ہر حال میں جئیں گے عرشؔ
ہم نے مانا فضا خراب سہی

دُور تر ہو اگر سیاست سے
کِتنا بہتر نظام ہو جائے

روح کی کوئی بھی نہیں منزل
پھر بھی گرمِ سفر سی رہتی ہے

آج کی زندگی کی اور کیا تفسیر کروں
جس طرح راہ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا سا

نادان اِن کے ڈوبنے کا اتنا غم نہ کر
ماہ ونُجوم یُوں بھی وقارِ سحر نہ تھے

مزاج آشنا موجوں کا ہو نہیں سکتا

اگر سفینہ تلاطم سے ہم کنار نہیں

تنقید کی حد سے کبھی تُم آگے نہ بڑھنا

تنقید ہی وہ فن ہے جو آسان بہت ہے

دِل میں نہیں یادوں کی کہیں گردِ سفر تک

مُدّت ہوئی اس راہ سے گزرا نہیں کوئی

نہیں ہے آسماں کی وُسعتوں سے کوئی غرض

جنم جنم سے ہے رشتہ مرا زمین کے ساتھ

مُسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جانا ہرگز

کب کوئی جانتا ہے کون ہے تنہا کتنا

جھونپڑوں کا بھی احترام کرو

جھونپڑوں میں بھی لوگ بستے ہیں

اُس کے من کی موج ہے وہ کب نکل آئے یہاں

رات ڈھلنے کو ہے پھر بھی بند دروازہ نہ کر

ہر کوئی ہے اپنے کاندھے پر اُٹھائے اپنی لاش

کیا کہوں مُجھ کو یہ منظر دیکھ کر کیسا لگا

نہیں ہے زندگی میں اب وہ گھما گھمی عرشؔ
کبھی تو ایسا لگے ہے کہ جھیل ڈل ہوں میں

نگاہِ خامشی سے دیکھتے رہیں اس کو
ہمیں ہے زندگی میں صرف اختیار اتنا

عجب نہیں کہ مُلاقات ہو ہی جائے عرشؔ
مُجھے ہے ایک زمانے سے انتظار اپنا

جمّوں کو فن سے فن کار سے کیا نسبت
یہ دھرتی ہر رنگ میں بنجر لگتی ہے

سزا کیا کیا ہوئی تجویز لیکن
نہ حق گوئی سے آئے باز ہم بھی

میں اپنی ذات کے اک بیکراں حصار میں ہُوں
نظر میں دور تک بکھرے ہوئے غبار میں ہُوں

آدمی کے وقار کا باعث
آدمی کے اصول ہوتے ہیں

مُجھے محفوظ رکھنا اپنے دل میں
اگر فُرصت مِلے تو یاد کرنا

عجیب بات کسی کی نہیں نظر اس پر
وہ اک کثیف اندھیرا جو ہے چراغ تلے

زندگی عزم و عمل کا نام ہے
کام آئے گی یہاں تقدیر کیا

زندگی دُھول ہے اور کُچھ بھی نہیں
کاغذی پُھول ہے اور کُچھ بھی نہیں

مری وفاؤں کا مذکور بار بار نہ کر
ذراسی بات کی خاطر تو شرمسار نہ کر

باوجود اِس کے رہا سب کی نظر کا مرکز
میں تیرے شہر سے بے نام ونشاں بھی گزرا

نہیں ہیں اہلِ سیاست ہی صرف اس صف میں
ہیں اور لوگ بھی جن کا کوئی ضمیر نہیں

ایک موسیقی سی اُبھری دور تک
دل کو صحرا کی صدا اچّھی لگی

زندگی سے یہ پوچھ لیں اے عرشؔ
اور اب کتنی دُور جانا ہے

کہاں پہ کھو گئے ہیں سائے اُن بزرگوں کے
کہاں ہیں پیڑ جو آنگن میں ایستادہ تھے

مرے وطن میں قلم کا کوئی وقار نہیں
نہ مجھ پہ طنز کریہ "صاحبِ قلم ہوں میں"

کس قدر چمکنے لگے گھر کے در و دیوار
آپ آئے ہیں دل کو تھی مگر آس بہت کم

یہ الگ بات کہ پتّھر ہی یہاں اُگتے ہیں
عرشؔ جموں کی یہ دھرتی بڑی زرخیز سہی

عرشؔ صہبائی کے تمام شائع شُدہ مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ بھی دستیاب نہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اُن کی اشاعت کا انتظام ازسرِ نو کیا جائے۔ دُعا کیجئے کہ ہمیں اس میں کامیابی نصیب ہو......آمین

"نایاب" عرشؔ صہبائی کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے۔ ہم اس کے چیدہ چیدہ اشعار پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ "نایاب" میں شامل غزلوں کے اشعار کی تعریف بے معنی محسوس ہوتی ہے اس کا سب سے الگ انداز ہے۔ اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عرشؔ صہبائی نے جہاں غزل کو نئی زمینیں دی ہیں

وہاں اُردو شاعری کو نئے اشعار بھی دئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے مجموعوں سے اشعار کا انتخاب کرنے میں ہم سے کوئی چُوک ہوگئی ہو لیکن اچھے اور نئے اشعار کا اتنا ذخیرہ ہے جو اس چُوک سے قطعاً متاثر نہیں ہوگا۔ لیجئے چند اشعار حاضرِ خدمت ہیں

کُچھ تو ہوگا اُفق کے اُس جانب
آ چلیں سرحدوں کے پار کبھی

ایک ندّی ہوں نہیں کم یہ مقدّر میرا
راستہ دیکھتا رہتا ہے سمندر میرا

اسے سَمجھنا کسی طرح بھی نہیں آساں
یہ زندگی ہے کہ جیسے ہو غیب کی آواز

ہر کوئی شہر میں بے نام و نشاں رہتا ہے
کس کو معلوم ہے یہ کون کہاں رہتا ہے

جناب عرشؔ صہبائی کے ابتدائی کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے استاد شاعر جوشؔ ملسیانی نے کہا تھا کہ عرشؔ صہبائی نے اُردو شاعری کو نئی زمینیں دی ہیں۔ یہ بات گو کافی پُرانی ہے لیکن اگر جناب عرشؔ کی شاعری پر طائرانہ نگاہ دوڑائی جائے تو بخوبی نظر آئے گا کہ انہوں نے اُردو شاعری کو نہ صرف نئی زمینیں دی ہیں بلکہ بے پناہ نئے شعر بھی دیئے ہیں۔ ان کے اولین مجموعہ کلام 'شکستہ جام' کی شاعری کو اگر خالص روایتی شاعری کہیں تو کوئی مبالغہ آمیزی نہ ہوگی لیکن جس ڈھنگ سے جناب عرشؔ نے

اس روایتی شاعری کو قارئین کے سامنے رکھا ہے وہ ان کا ہی حصّہ ہے۔لیکن اس کے بعد کی شاعری کا سفر جیسے کہ ''شگفتِ گل'' ''صلیب'' ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' ''اسلوب'' ''ریزہ ریزہ وجود'' ''اساس ''اور'' نایاب'' تک جو ابھی جاری ہے ان میں بے شمار ایسے شعر ہیں جو روایتی جدید نہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں جدید ہیں۔ان شعروں میں ہمیں دلِ دردمند کی صدائے احتجاج سنائی دیتی ہے۔حوالے کے طور پر چند اشعار پیش کرر ہا ہوں جیسے کہ

تم جو چھُو لو گے تو بڑھ جائے گی قیمت میری
گیلی مٹی ہوں کھلونا ہی بنا لو مُجھ کو

کبھی ثابت قدم رہتے نہیں پروردۂ ظلمت
ستارے کانپتے ہیں جب سحر نزدیک ہوتی ہے

اس کے ہر منظر پہ مٹ جا اس کا پس منظر نہ دیکھ
زندگی اک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

یہ چاہتا ہے کہ اس دور پہ کروں تنقید
وہ شخص قبر میں زندہ اُتارتا ہے مُجھے

ایسے بے شمار اشعار ''صلیب ' سے لے کر'' اساس '' تک ملتے ہیں۔ جناب عرشؔ کی تصنیفات کا نزدیکی جائزہ لینے کے بعد ماہر غالبیات جناب کالی داس گپتا رضاؔ نے کہا تھا کہ میری نظر میں ہندوستان کے 25 دانشور ایسے ہیں جن

کا ادب کی دُنیا میں ہمیشہ ذکر ہوتا رہے گا۔ ان دانشوروں میں ایک نام عرشؔ صہبائی کا بھی ہے۔ خیر اس وقت ماضی میں جھانکنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس وقت میرے پیشِ نظر عرشؔ صہبائی کا نیا مجموعہ کلام نایاب ہے۔ ’’ نایاب ‘‘ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنا غلَط نہ ہوگا کہ جس طرح شعر و ادب کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ انسان کو نئے ذہنی تناظر فراہم کرتا رہے تا کہ انسانی شعور حقائق کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھ سکے اور ان کے حسن یا قباحت کو بہتر طور پر محسوس کر سکے۔ اچھے اور بڑے شاعر جب شعر کہتے ہیں تو قاری کے شعور میں توسیع کا سبب بنتے ہیں اور عرشؔ کی شاعری میں یہی خصوصیت ہے کہ وہ جب شعر کہتے ہیں تو لوگوں کو وہ سُن کر یا پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرشؔ نے اپنی ذہنی تسکین کے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے شعر کہے ہیں۔ یعنی شاعر نے اپنے شعروں میں ہماری بات کہی ہے اور یہی بات شاعر کا اچھا یا بڑا شاعر کہلانے میں ایک سیڑھی کا کام دیتی ہے اور شاید میری اس بات کی تصدیق ’’نایاب‘‘ کے یہ چند اشعار کر سکیں گے، ملاحظہ فرمایئے

ایک ندی ہوں نہیں کم یہ مقدر میرا
راستہ دیکھتا رہتا ہے سمندر میرا

باوجود اس کے تردّد میں یقیں رکھتا ہوں
مجھ کو معلوم ہے جو بھی ہے مقدر میرا

وہ ایک شخص جو معصوم بھی ہے سادہ بھی
وہ ایک شخص حقیقت میں ہے زمانہ ساز

حادثوں کو نہیں توفیق اسے روک سکیں
دل کے جذبات کا دریا ہے رواں رہتا ہے

رموزِ زندگی ظاہر ہیں اُن پر
وہ سڑکوں پر جو پتھر توڑتے ہیں

یہ سمجھ لینا بہت نزدیک ہے اس کا زوال
عرشؔ انساں مُختلف خانوں میں جب بٹ جائے گا

دوریوں کو اب نہ وسعت دیجئے
روکئے صحرا کا یہ پھیلاؤ سا

شہران کا نئی تہذیب کا مرکز ہی سہی
ہم بھی مٹتی ہوئی قدروں کے نشاں لے کے چلے

فنکاروں کو سودوزیاں سے کیا مطلب
فنکاروں نے کیا پانا کیا کھونا ہے

حقیقت میں ہے وہ تخلیق اپنی
جسے اپنا خُدا ہم مانتے ہیں

اک سُہانے سفر سے گزرے ہیں
اشک جو چشمِ تر سے گزرے ہیں

آج کل ادبی محفلوں اور مشاعروں میں نجی مفاد کے پیشِ نظر سیاسی لوگوں کو مہمانِ خصوصی یا صدارت کرنے کے لئے مدعو کرنے کی ایک روایت سی بن گئی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ سیاسی شخصیت شعر کے ابجد سے بھی واقف نہ ہو ایسے موقع کے لئے جناب عرشؔ یوں فرماتے ہیں۔

کوئی تقریب ہو شعر و ادب سے لاکھ وابستہ
مگر اس پر سیاست کا دھواں سا پھیل جاتا ہے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ تجربے کرتا رہا ہے اور اسی تناظر میں جناب عرشؔ کہتے ہیں۔

زندگی تجربوں سے اور نکھر جاتی ہے
اس لئے عین ضروری ہے سفر ہیں رہیئے

یعنی کہ عرش صاحب اب غزلوں کے راہ گزر سے دوہوں کی راہ گزر پر گامزن ہو چلے ہیں اور نایاب کے آخری صفحات پر ان کے دوہوں نے رونق بخشی ہے جیسے کہ:۔

کہیں پہ کانٹے پھول ہیں کہیں پہ چھاؤں دھوپ
کہنے کو وہ ایک ہیں لیکن کتنے روپ

اک پل میں مٹ جائے گا ریت کی ہے وہ لکیر
دنیا میں جس شخص کا کوئی نہیں ضمیر

اور آخر میں جناب عرشؔ کے اس شعر کے ساتھ ہی رخصت چاہوں گا۔

میرے اشعار میں سو خامیاں ہوں گی اے عرشؔ
میں بھی انساں ہوں انساں سے خطا ہوتی ہے

باب چہارم

عرشؔ صہبائی کی زندگی کے کچھ

دلچسپ واقعات

عرشؔ صاحب کی زندگی مختلف واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ واقعات ذاتی نوعیت کے ہیں اور بے حد دلچسپ۔ اگر ان میں کوئی کمی ہے تو اس بات کی کہ ان میں تاریخ کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۴۷ء کا ہے۔ مُلک کی تقسیم کی وجہ سے حالات دگرگُوں تھے۔ ان سے صرف شہر ہی نہیں بلکہ دیہات بھی متاثر ہوئے تھے۔ ہر جگہ بے چینی کا عالم تھا۔ تمام اسکول بند تھے۔ عرشؔ صاحب کے دل میں کیا آئی کہ ایک شام کو اَپنے ایک دوست کے ساتھ گھر سے غائب ہو گئے۔ گھر والے رات بھر پریشان رہے کہ حضرت کہاں گئے۔ جب معلوم ہُوا کہ اُن کا ایک اور دوست بھی اُن کے ساتھ ہے تو اطمینان ہُوا۔ ہُوا یہ کہ شام ڈھلنے سے پہلے توی پار کر کے مانسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جمّوں سے چند میل ہی دور گئے ہوں گے کہ رات پڑ گئی۔ یہ رات اُنہوں نے راستے میں ایک پہاڑی مقام پر ایک دُکان دار سے بستر وغیرہ لے کر بسر کی۔ اُس کے بعد سَر وئیں سَر، مان سَر چینینی، رام کوٹ، بھدّو جا پہنچے۔ حسنِ اتفاق سے بھدّو میں اُن کے ایک بہت قریبی دوست جناب اے۔ پی۔ سونی سے مُلاقات ہو گئی۔ وہ انہیں کی گلی میں رہتے تھے۔ اُس وقت وہ اپنے گاؤں گئے تھے۔ ایک رات وہاں گزاری۔ اُس کے بعد بلاور ہوتے ہوئے ماتا سُر کالا دیوی پہنچے۔ اور پھر واپسی پر بلاور سے براستہ مہان پُور، بسوہلی۔ سونی صاحب نے اُنہیں بسوہلی کے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کا پتہ دیا ہُوا تھا۔ ایک رات وہاں قیام کیا۔ تمام راستے بند تھے اس لئے یہ سفر پیدل جاری رہا۔ بسوہلی سے روانہ ہو کر کٹھوعہ قیام کیا۔ ان دِنوں کٹھوعہ کو پٹھانکوٹ سے جوڑنے والا پُل

بارشوں کی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے لوگوں کی بہت بھیڑ تھی جو مختلف مقامات سے
ہجرت کر کے وہاں موجود تھے اور پٹھانکوٹ جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی بھی صورت
نہیں تھی کہ جا سکیں۔ دریائے راوی میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ کئی جیالے دریا میں تیر
کر پانی کی گہرائی اور بہاؤ کا اندازہ لگا رہے تھے۔ حضرت بھی اُن میں شامل ہو گئے۔
تیرنا خوب جانتے تھے راوی کے اُس پار تو چلے گئے لیکن واپسی پر خود کو سنبھال نہیں
پائے۔ معلوم ہُوا کہ اِن کا دوست تو دریا میں قدم رکھتے ہی پانی میں بہہ گیا تھا۔ لیکن
خیریت گزری کہ کچھ دُوری پر دریا کے کنارے کھڑے لوگوں نے اُسے بچا لیا۔ خیر یہ خود
ہمّت کر کے دوسرے کنارے پر واپس پہنچ گئے۔ بے حد گھبراہٹ میں تھے اِن کا دوسرا
دوست مِلا تو ہوش ٹھکانے آئے۔ پھر دوسرے روز صُبح کٹھوعہ سے چلے اور رات ۹
بجے کے قریب جموں پہنچے۔ گھر والوں سے اُلٹی سیدھی باتیں سُننی پڑیں۔ اُن کا یہ تمام
سفر کوئی ۱۲ دن میں طے ہُوا۔ بتاتے ہیں کہ راستہ میں کھانا وغیرہ دستیاب ہوتا رہا۔ اور
دیہات کے لوگ بے حد محبّت سے پیش آئے۔ وہ اُن کے سفر کے ارادہ پر حیرت زدہ بھی
تھے کہ کن حالات میں وہ گھر سے نکلے ہیں۔ اُن کی ہمّت کی داد بھی دیتے تھے۔ وہ ملنے
والوں کو یہی بتاتے تھے کہ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے نکلے ہوئے ہیں۔ اس
لئے سبھی اُن سے ملنے والوں کی ہمدردی اُن کے ساتھ تھی۔ اُن کے والد صاحب اور
بڑے بھائی صاحب نے بڑے طریقہ سے سمجھایا کہ آئندہ ایسی بات نہ کریں اور اُنہوں
نے جانا ہی تھا تو بتا کر جاتے، اسکول تو بند تھے۔ گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔
عرشؔ صاحب نے بھی شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ یہ سراسر زیادتی تھی اور نہایت غیر

ذمہ دارانہ عمل تھا۔

موصوف پہلے بھی ایک بار بذریعہ ٹرین جموں سے سیالکوٹ، سیالکوٹ سے وزیر آباد اور وہاں سے لالہ موسیٰ ہوتے ہوئے گجرات پہنچے تھے۔ وہاں سے ٹانگہ پر جلال پُور جٹّاں اور جلال پور جٹّاں سے ابڑیالہ۔ وہاں ان کا ایک دوست شری رام پُوری مل گیا۔ دو روز وہاں قیام کیا۔ اُنہوں نے کِسی کی رہنمائی میں انہیں مناور تک پہنچایا۔ وہاں چھمب سے ہوتے ہوئے اپنے ننہال پہنچے۔ گھر والوں کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ ننہال میں ہوں گے۔ ان کے برادرِ اکبر وہاں سے انہیں جموں لے آئے۔

ان کے بارے میں ایک اور دلچسپ واقعہ گوش گزار ہو۔ اُن کے دوہتے شری ابھنیوں کی مونڈن کی تقریب تھی ۔ یہ تقریب جموں سے چند کلو میٹر دور نگروٹہ سے کُچھ دور توّی عُبور کرنے کے بعد ایک مقدّس مقام ''بھیڑ دیوتا'' پر منائی جاتی ہے۔ اُس وقت وہاں کوئی پُل نہ تھا اور نہ ہی کوئی کشتی موجود تھی۔ آنے جانے والے پیدل ہی توّی عُبور کرتے تھے۔ توّی میں پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ توی عبور کرتے وقت ایک عورت پانی میں بہہ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عرشؔ صاحب بھی پانی میں کُود گئے اور تھوڑی دُور جا کر اُسے بچالیا۔ اُس وقت اُن کی تیراکی کام آئی۔ سب نے اُن کی ہمّت اور جرأت کی داد دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ اس کے بعد مطلوبہ تقریب خوشگوار طور پر سر انجام پائی۔ اس بات کا سب کو اعتراف تھا کہ اتنے تیز بہاؤ والے پانی میں کودنا آسان کام نہیں تھا۔

عرشؔ صاحب ہر سال جالندھر کے ایک غیر سرکاری مشاعرہ

میں شریک ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ اُن کے ایک عزیز دوست جناب ٹی۔ آر۔ سمن سیشن جج کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ سُمن صاحب عرشؔ صاحب کے قدر دانوں میں سے تھے۔ اس مشاعرہ میں فراقؔ گورکھپوری، پنڈت میلا رام وفاؔ اور نعیش کُمار شادؔ جیسے عظیم شاعر شرکت کرتے تھے۔ جن کی شاعری پر مُلک کو ناز ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فیصلہ ہوا کہ عرشؔ صاحب صُبح سُمن سے ملنے کے بعد جمّوں کے لئے روانہ ہوں گے اور صُبح ہی اُنہیں معاوضہ بھی ادا کیا جائے گا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ایک اور ملاقات ہو جائے گی۔ عرشؔ صاحب کا قیام دوسرے مہمان شُعرا کے ساتھ جالندھر کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں تھا۔ موصوف ہوٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ اُنہوں نے اگرچہ مشاعرہ میں شریک ہونے سے پہلے سُمن صاحب کو لکھ بھی دیا تھا لیکن سُمن صاحب نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ جب وہ صُبح سُمن صاحب کے ہاں پہنچے تو وہاں لان میں فراق گورکھپوری صاحب ایک کُرسی پر تشریف فرما تھے۔ سُمن صاحب نے جب اُن سے عرشؔ صاحب کا تعارف کروانہ چاہا تو فراقؔ صاحب نے فرمایا کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ انہیں جانتے ہیں۔ رسائل و جرائد میں اُن کا کلام بھی پڑھتے رہتے ہیں اور کئی مشاعروں میں بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے ملتے ہی عرشؔ صاحب سے کہا کہ وہ اُن سے ذاتی نوعیّت کے دو سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ اُنہوں نے عرشؔ صہبائی تخلّص کس رعائیت سے رکھا ہے؟ عرشؔ صاحب نے جواب میں کہا کہ کسی رعائیت سے بھی نہیں۔ چونکہ اُن کے والد صاحب مختلف فرقوں میں یقین نہیں رکھتے تھے اور اُن کی نظر میں صرف ایک ہی مذہب تھا اور وہ صرف انسانیت تھا۔ اس لئے اگر میری پہچان ہو تو

صرف میرے کلام کی وجہ سے، نہ کہ اس بنیاد پر کہ میں فلاں فرقہ سے تعلّق رکھتا ہوں۔

فراقؔ صاحب نے عرشؔ صاحب کے علاوہ اُن کے والد صاحب کی بھی تعریف کی۔ اور بے حد خوش ہوئے جبکہ آج کے دور میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ فراقؔ صاحب نے کہا کہ وہ ایک اور سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ عرشؔ صاحب نے کہا ''فرمائیے'' یہ سوال شائد عرشؔ صاحب کا امتحان لینے کی غرض سے تھا۔ اُن دنوں احسان دانشؔ نے حفیظؔ جالندھری کے خلاف ایک مضمون تحریر کیا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ حفیظؔ جالندھری گیت کے شاعر ہیں۔ یہ مضمون دیر تک ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا رہا۔ فراقؔ صاحب فرمانے لگے ''آپ نے وہ مضمون پڑھا ہوگا'' عرشؔ صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فراقؔ صاحب جاننا چاہتے تھے کہ اُس مضمون میں کیا کمی تھی۔ جہاں تک قابلیت کا تعلق ہے عرشؔ صاحب کو اعتراف تھا کہ وہ اُن کی خاکِ پا بھی نہیں۔ پھر بھی اُنہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا۔ اس مضمون میں صرف ایک لفظ کی کمی ہے۔ فراقؔ صاحب کے اسرار پر عرشؔ صاحب نے کہا۔ ''اگر مضمون کے آخر میں ''مجموعی طور'' پر کا استعمال ہوتا تو مسئلہ حل ہو جاتا اور اس طرح دانش صاحب کا مضموں بحث کا مرکز نہ بنتا۔ کیونکہ ''مجموعی طور'' پر لکھنے سے اس بات کا اعتراف ہو جاتا کہ حفیظ صاحب شاعری کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور دانش صاحب اپنی یہ بات کہنے میں بھی کامیاب ہو جاتے کہ حفیظ صاحب مجموعی طور پر گیت کے شاعر ہیں۔ فراقؔ صاحب نے عرش صاحب کی بے حد تعریف کی۔ وہاں موجود باقی اصحاب نے بھی عرشؔ صاحب کو سراہا اور اُن کی خود اعتمادی کی بھی

تعریف کی کہ اُنہوں نے کس طرح مسئلے کا حل نکالا۔ آج کے دَور میں یہ باتیں کہاں۔

موصوف کی زندگی کے ایک اہم واقعہ سے قارین لُطف اندوز ہوں گے۔ اُنہوں نے پہلے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ زندگی بھر دوسروں کی سازشوں کا شکار رہے ہیں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ریڈیو کشمیر جموں کے ڈائریکٹر شری وی۔ بی۔ اگروال تھے وہ ہندی کے ایک اہم کوی تھے۔ یہاں آتے ہی کُچھ چاپلوس قسم کے ملازموں نے اُنہیں گھیرے میں لے لیا اور اُنہیں یقین دلایا کہ اگر ریڈیو اسٹیشن پر اُن کا کوئی خیر خواہ ہے تو وہی ہیں۔ اس کا مقصد عرشؔ صاحب کے لئے پریشانیاں پیدا کرنا تھا۔ نتیجہ کے طور پر ہر دو ماہ کے بعد عرشؔ صاحب کی تبدیلی دوسری سیکشن میں کردی جاتی یا اُنہیں کوئی ایسا کام دے دیا جاتا جواُن کے لئے پریشانی کا سبب بنے۔ لیکن عرشؔ صاحب نے پریشان ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ کام سے بخوبی واقف تھے۔ جب چاپلوس قسم کے لوگ اُن سے نئے کام کے بارے میں اُن کی رائے جاننا چاہتے تو عرشؔ صاحب کا جواب ہوتا '' کاش یہ کام اُنہیں پہلے ملا ہوتا'' اس سے وہ لوگ بے حد پریشان ہوتے اُس کے بعد اُنہیں کوئی اور کام دیا جاتا۔ یہ کھیل جاری رہتا۔ اگروال صاحب کہا کرتے تھے ''میں عرشؔ کو وہاں ماروں گا جہاں پانی نہ مِلے'' ایک بار شری بی۔ کے۔ ڈوگرہ نے جو تمام پروگرام شعبوں کے سربراہ تھے عرشؔ کا تبادلہ اپنی سیکشن میں کروالیا۔ وہ بے حد خوش تھے کہ سیکشن کے کام کے بارے میں فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ عرشؔ صاحب تمام کام مکمّل کر دیتے اور ڈوگرہ صاحب کو صرف کاغذات پر دستخط کرنے کی زحمت کرنا پڑتی۔ ایک روز ڈوگرہ صاحب نے اگروال صاحب سے

خُود ہی بات چھیڑی۔ اور کہا " آپ ہر وقت کہتے رہتے ہیں عرشؔ کو وہاں ماروں گا جہاں پانی نہ ملے۔ آپ ڈاریکٹر جرنل کو خط لکھ کر اُس کا تبادلہ کہیں دوسرے اسٹیشن پر کیوں نہیں کروا لیتے" اگروال صاحب نے دوسرے لمحے ہی اس کا جواب دیا۔ " تبادلہ تو میں ٹیلفون پر بھی کروا سکتا ہوں لیکن ایسا ذہین اور قابل شخص کہاں سے لاؤں گا "

ایک روز ڈوگرہ صاحب نے عرشؔ صاحب سے کہا کہ وہ کبھی خُود اگروال صاحب سے دریافت کریں کہ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ ایک روز اگروال صاحب نے عرشؔ صاحب کو خُود کمرے میں بُلایا اور کہا کہ وہ " غبارِ خاطر " مولانا ابو کلام آزاد کی تصنیف کو سامنے رکھ کر بچّوں کے پروگرام کے لیے ایک Talk لِکھ دیں۔ یہ وہ مجموعہ ہے جسے سمجھنا ایم۔ اے کے طلبا کے بس کی بات بھی نہیں۔ چند روز کے بعد عرشؔ صاحب Talk لِکھ کر ڈاریکٹر صاحب کے پاس گئے۔ چونکہ ڈاریکٹر صاحب اُردو نہیں جانتے تھے اس لئے عرشؔ صاحب کو کُرسی پیش کی اور پڑھ کر سُنانے کے لئے کہا۔ Talk سُننے کے بعد اُنہوں نے اس کا مسودہ اُنہیں دینے کے لئے کہا۔ عرشؔ صاحب نے دریافت کیا کہ آپ اسے کیا کریں گے۔ اگروال صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا کہ " میں اس پر very good talk لِکھوں گا اور ایسا میں زندگی میں پہلی بار لِکھوں گا "

عرشؔ صاحب نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔ اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں ایسی کئی Talks لکھ سکتا ہوں۔ مُجھے اس حوصلہ افزائی کی ضرورت نہیں۔ موصوف بے حد صاف گو تھے اور جو بات کہنا ہو مُنہ پر کہہ دیتے تھے۔ اگروال صاحب خاموش ہو گئے لیکن وہ عرشؔ صاحب سے بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ عرشؔ صاحب نے وقت کی

نزاکت کو دیکھتے ہوئے عرض کیا "جناب آپ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ عرشؔ کو وہاں ماروں گا جہاں پانی نہ ملے۔ آخر مُجھ سے ایسی کیا گستاخی ہوئی ہے" اگروال صاحب مُسکرائے اور کہنے لگے "آپ کو تین سال کے عرصہ میں آج پہلی بار دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "عید کے روز چیف منسٹر کے ہاں ضیافت کا اہتمام تھا۔ آپ میری کُرسی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مُجھے یہ اچّھا نہیں لگا "عرشؔ صاحب کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ کہا "جناب آپ کو اس لئے بلایا گیا تھا کہ آپ اسٹیشن ڈاریکٹر ہیں۔ جو اسٹیشن ڈاریکٹر بھی آئے گا اُسے بُلایا جائے گا۔ مُجھے بُلایا گیا تھا کہ میں عرشؔ صہبائی ہوں۔ میری حیثیت اور اہمیت ہمیشہ یہی رہے گی۔ مُجھے اِس لئے نہیں بُلایا گیا تھا کہ میں آپ کے ماتحت ہوں " اگروال صاحب خاموش ہوگئے اور اس کے بعد اُنہوں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ حُسنِ اتفاق سے دو ہفتہ کے بعد اگروال صاحب کا تبادلہ الہ آباد ریڈیو اسٹیشن پر ہوگیا۔

ریڈیو اسٹیشن پر اُنہیں الوداع کہنے والوں میں صرف بی۔ کے ڈوگرہ اور عرشؔ صہبائی تھے۔ اگروال صاحب نے دونوں کا بے حد شکریہ ادا کیا اور عرشؔ صاحب سے خاص طور پر کہا" میں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا اور آپ کا یہ اخلاق کہ مُجھے الوداع کہنے آگئے " یہ کہتے وقت اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اُس وقت اُن کا کوئی چاپلوس وہاں نہیں تھا۔ عرشؔ صاحب کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ واقعات اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

ایک اور معمولی سا واقعہ بھی گوش گزار ہو۔ عرشؔ صاحب ایک روز کسی کام سے سرکاری ہسپتال میں گئے۔ اتنے میں تین افراد ایک شخص کو تھامے ہوئے strature پر لٹا رہے تھے وہ بے حد بیمار تھا۔ عرشؔ صاحب اُن کے ساتھ ہو لئے اور strature متعلقہ کمرے میں لے جانے میں تعاون دیا۔ اُنہیں کمرے میں پہنچ کر احساس ہوا کہ یہ چوتھا شخص کوئی نا آشنا تھا۔ اُنہوں نے عرشؔ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ عرشؔ صاحب نے بڑی عاجزی سے جواب دیا " میں کوئی نہیں ہوں۔ شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے جن کی وجہ سے مجھے ایک اہم فرض ادا کرنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ "

موصُوف کی زندگی ایسے کئی واقعات سے جڑی ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں اُن کا نظریہ کیا ہے اور وہ کس طرح اس پر عمل کرتے ہیں اُن کے لئے غیر اور اپنا ایک سا ہے۔ وہ مذہب و مِلّت کے امتیاز سے بھی بہت پرے ہیں۔ وہ بھی اپنے والد صاحب کی طرح انسانیت کو سب سے بڑا مذہب تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے اُن کے خیالات کو وُسعت مِلی ہے۔ اور زندگی کی مثبت سوچ حاصل ہوئی ہے۔ اگرچہ انسان کا جسمانی طور پر بھی صحت مند ہونا بے حد ضروری ہے لیکن بقول اُن کے " انسان کو ذہنی طور پر بھی صحت مند ہونا چاہیئے۔" کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم عرشؔ صہبائی سے نہیں بلکہ کسی پہنچے ہوئے فقیر سے ملے ہیں۔ اس طرح موصوف کی کئی شخصیتیں سامنے آئی ہیں۔ ہر شخصیت پُر کشش اور محبت سے لبریز۔ اُن کی خود اعتمادی بھی مثالی ہے۔ اُن کی صاف گوئی اُن کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے چونکہ

وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کہتے اس لئے اُن کی صاف گوئی کبھی کبھی اُن کے لئے نقصان وہ ثابت ہوئی ہے۔ بقول بےتابؔ جے پوری۔ ''عرشؔ صاحب دُشمن بنانے میں ماہر ہیں '' لیکن حیرت کا مقام ہے کہ وہ جب اپنے دُشمنوں سے بھی ملتے ہیں تو مُسکرا کر ملتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کے بے شمار دُشمن ہیں لیکن وہ کسی کے دُشمن نہیں۔ وہ ہر اُس شخص کا احترام کرتے ہیں جو کسی خوبی کا اہل ہے۔ اُن کی اس بات کی جسقدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اُن کا قول ہے '' میری ذات سے دوسروں کو فائدہ پُہنچنا چاہئے۔ اُن کے مطابق زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لئے ہو۔ وہ صرف ایسا کہتے ہی نہیں بلکہ اُس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ وہ اُس شخص کو بدقسمت تصوّر کرتے ہیں جو اُن کا دُشمن ہے۔ وہ اُس سے ہمدردانہ رویّہ رکھتے ہیں۔ اُن کا یہ جملہ بے حد دلچسپی کا باعث ہے'' میں اپنے بارے میں کوئی اچّھی رائے نہیں رکھتا '' یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے۔ اُنہیں چاہنے والوں کی تعداد کافی ہے جو اُنہیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ صاف گوئی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سمجھتے ہیں۔ اور اُن پر نچھاور ہوتے ہیں۔ ریاست سے باہر اُن کے چاہنے والوں کا حلقہ وسیع ہی نہیں بلکہ وسیع تر ہے۔ اُن کی شاعری کو پسند کرنے والے برِصغیر سے باہر بھی ہیں۔ عرشؔ صاحب کو خود احساس نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ اُنہیں ملنے کے بعد لگتا ہے کہ ہم کسی نہایت سادہ اور معمولی شخص سے ملے ہیں۔ لیکن ملاقات کے بعد یہ نظریہ بدلنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کام سے مایوس نہیں وہ ہر وقت اس میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن کے اس نظریہ کی بھی تعریف کرنا ہوگی ''میری شاعری قُدرت کی دین ہے۔ یہ ایک ایسی امانت ہے

جس میں مجھے خیانت کرنے کا کوئی حق نہیں ''ریاستی سطح پر چھوڑیئے، مُلکی سطح پر بھی اُنہوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے جس کا اعتراف ہوا ہے۔ اگرچہ اُنہیں اُستاد شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر بھی اپنے آپ کو اُردو ادب کا ایک طالبِ علم گردانتے ہیں اور گردانتے رہیں گے۔

موصوف وعدے کے بڑے پابند ہیں۔ کسی صورت میں بھی جُھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔ اگر کسی سے ملاقات کے لئے وقت مقرّر کریں گے تو مقرّرہ وقت سے پہلے پہنچیں گے تاکہ دوسرے کو کسی قسم کی ذہنی کوفت نہ ہو۔ لیکن اُن کے ساتھ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ اگر اُن کے کسی مخالف نے بھی اُنہیں خط لِکھا ہو تو اُس کا جواب ضرور دیتے ہیں۔ اسے وہ اخلاقی فرض قرار دیتے ہیں۔ اُن کے کئی ایسے کرم فرما بھی ہیں جو اُن کے خط کا جواب نہیں دیتے لیکن اُن کی تعداد بُہت ہی کم ہے۔ پھر بھی اُنہیں ایسے لوگوں سے ہمدردی ہے۔ ایک بار اُنہیں کسی صاحب نے بریلی سے مشاعرہ کا دعوت نامہ بھیجا اور درخواست کی کہ وُہ مشاعرہ میں ضرور شرکت کریں کیوں کہ سامعین اُنہیں سُننا چاہتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جنہوں نے اُنہیں مدّعو کیا ہے وہ نہایت غیر ذمّہ دار شخصیت کے مالک ہیں جس شخص نے یہ انکشاف کیا اُس شخص نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ مشاعرہ میں شریک نہ ہوں۔ اس سلسلے میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جائے گا اور اُنہیں تحریر کردہ معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن عرشؔ صاحب اس کے حق میں نہیں تھے اُنہوں نے اخلاقی طور پر متعلقہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ بے شک مشاعرہ کے بعد اُنہیں معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اُن کا قیام

بھی اُسی کرم فرما کے ہاں تھا۔ اُس نے خُود بھی عرشؔ صاحب کی طبیعت کی تعریف کی۔ عرشؔ صاحب کی یہ دلیل تھی کہ مشاعرہ کے منتظم نے اُنہیں دھوکا دیا ہے۔ اُنہوں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ بعد میں جمّوں پہنچ کر اُنہوں نے اُن صاحب کو خط لِکھا جنہوں نے اُنہیں مدّعو کیا ہوا تھا۔ خط میں صرف یہ بات درج تھی۔ "خُدا آپ کو ایک اچھا اور ذمّہ دار انسان بننے کی توفیق دے۔"

آج سے ۵۴ برس پہلے کی بات ہے کہ جمّوں میں ایک بزم کی بُنیاد رکھّی گئی تھی۔ اِسے بزمِ اُردو ادب کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے زیرِ اہتمام ایک کُل ہند مشاعرہ کا بھی اہتمام ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ بزم بکھرتی گئی لیکن عرشؔ صاحب کی ذات سے یہ قائم رہی۔ موصوف خُود بھی ایک تنظیم تھے۔ اس زمانے میں اُن کی مُلاقات سیّد فتح حسین ظفرؔ کاظمی صاحب سے ہوئی۔ کاظمی صاحب کی زیرِ سرپرستی جمّوں میں ۲۰ برس تک مشاعرے ہوتے رہے۔ شروع شروع میں سال میں ایک مشاعرہ ہوتا تھا بعد میں یہ دو ہونے لگے۔ لیکن یہ سب کُچھ کاظمی صاحب کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے تھا۔ یہاں ایک مشاعرہ ایسا بھی ہوا جو رات کے ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ یہ اُس زمانے سے لے کر آج تک واحد مشاعرہ تھا۔ اس میں لسان الاعجاز پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ اور جناب نریش کمار شادؔ بھی شامل ہُوئے تھے۔ وفاؔ صاحب کو اکثر تکلیف دی جاتی تھی اور وہ اس کرم سے نوازتے تھے۔ اس طرح بے شمار غیر ریاستی شاعروں کو جمّوں کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ سلسلہ اس وقت بند ہُوا جب عرشؔ صاحب ایڈمنسٹریٹیو آفیسر بن کر جمّوں سے باہر چلے گئے۔ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر جنوری ۱۹۸۹ء میں جمّوں آئے۔ اور

جناب ظفر کاظمی صاحب سے مُلاقات کا شرف حاصل ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ مشاعروں کا وہ سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے لیکن اُردو زبان کی بدقسمتی کہ اس کے دو ماہ بعد ہی کاظمی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور ایک بہت اچھی روایت قائم نہ رہ سکی۔ اُس زمانے میں جموں اُردو ادب کا گہوارہ کہلانے لگا تھا۔ ان مشاعروں میں کئی نامور شعرا تشریف لاتے تھے۔ جن کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوا کرتی تھی۔ اس سے سامعین کا مذاق بھی بُلند ہوتا تھا۔ شعروشاعری کے اکثر چرچے ہوتے تھے۔ اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ ماحول۔ اب اُردو زبان زوال پذیر ہے اور بالخصوص اُردو شاعری۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے پر جموں پہنچنے کے بعد ریاست کے ایک بزرگ صحافی جناب رگھبیر سنگھ مُکت سے عرشؔ صاحب کی مُلاقات ہوئی۔ اُنہوں نے موصوف کو صحافت کی طرف مائل ہی نہیں کیا بلکہ ایک اخبار میں کام کرنے کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا۔ اُس کے بعد عرشؔ صاحب تقریباً کئی اخباروں کے لئے کام کرتے رہے اور یہ سلسلہ ۸ سال تک جاری رہا۔ لیکن اُن کے تحریر کردہ ایڈیٹوریل متعلقہ اخبار کے ایڈیٹر کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ عرشؔ صاحب اگرچہ بڑے شوق سے یہ کام کرتے تھے لیکن وہ اس سے ہرگز مطمئن نہیں تھے۔

بعض اخباروں کے ایڈیٹر اَن پڑھ تھے۔ آخر ایک دن اُنہوں نے صحافت سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ایک ایڈیٹر تھے جو ''رازدان'' کے نام سے مشہور تھے۔ جب عرش صاحب نے مہینہ بھر کام کرنے کی اُجرت مانگی تو فرمانے لگے ''میں یہ رقم پیشگی دے چُکا ہوں۔'' اور اس کا ثبوت یہ تھا

کہ اُنہوں نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہوا تھا۔ آپ اندازہ کیجئے کسی کارکُن کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اس طرح ایک اور ایڈیٹر جن کا تعلّق کشمیرِ ثانی بھدرواہ سے تھا اور جموں سے اخبار شائع کرتے تھے دو ماہ کی اُجرت ڈکار گئے۔ چونکہ عرشؔ صاحب وقت گزارنے کے لئے اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے ان دونوں واقعات کو نظر انداز کر دیا اور اُن سے ہمدردی کے طور پر صحافت کو ہی خیر آباد کہہ دیا۔ موصوف کسی زمانے میں گھریلو حالات کی وجہ سے دفتر کے اوقات کے بعد کسی دُکان پر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ ایسا اُنہوں نے اپنی اہلیہ کی مستقل بیماری کی وجہ سے کیا تھا۔ آخر وہ کام بھی چھوڑ دیا۔ کام اُن کی طبعیت کے مطابق نہیں تھا۔ یہ کاروباری دکان تھی پھر بھی وہاں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ اس طرح ایک اور صاحب تھے۔ جو کبھی اُردو میں اخبار نکالتے تھے تو کبھی انگریزی میں۔ وہاں سے تنگ آ کر عرشؔ صاحب خود چلے آئے۔ ایڈیٹر صاحب کو ایک ماہ کی اُجرت کا فائدہ پہنچا دیا۔ عرشؔ صاحب کے ایڈیٹوریل بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ ایک روز ایک ایڈیٹر نے اُن کے ایڈیٹوریل کی تعریف کی۔ عرشؔ صاحب نے کہا کہ آپ بھی اپنے اخبار کے لئے روزانہ ایڈیٹوریل مُجھ سے لکھوالیا کریں اُن کی مجبوری ادویات کی بھاری رقم تھی جو ہر ماہ اپنی اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتی تھی۔ ایڈیٹر نے جواب دیا جو بے حد دلچسپ تھا ''آپ شائد میرا اخبار نہیں دیکھتے۔ جو ایڈیٹوریل آپ اُس اخبار میں لکھتے ہیں جہاں آپ مستقل تین گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ دوسرے روز وہی ایڈیٹوریل میرے اخبار میں ہوتا ہے۔'' وہ عرشؔ صاحب کے دوست ہی تھے۔ دیر تک دونوں ہنستے رہے۔ جب عرشؔ صاحب دوردرشن

سرینگر کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جموں آئے تو اُن کی اہلیہ کی صحت طویل بیماری کے باعث روز بہ روز گرتی جارہی تھی لیکن وہ خود اعتمادی کے باعث کسی کو احساس نہیں ہونے دیتی تھیں لیکن صورتِ حال سے سب کچھ نمایاں تھا۔ اُن کے بچّوں نے اُن کے علاج میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اس کے باوجود تکلیف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ کسی نے اُنہیں مشورہ دیا کہ وہ پی جی آئی چندی گڑھ میں آپریشن کروائیں۔ اُن کے دونوں گھٹنے جُڑ گئے تھے اور وہ چارپائی سے اُٹھ نہیں سکتی تھیں۔ پی جی آئی میں بھی داخلہ آسان نہیں تھا۔ اُنہیں تین بار وہاں جانا پڑا۔ ہر بار مایوسی ہوتی، اس کے باوجود گھر کے افراد میں سے کِسی نے بھی دل چھوٹا نہ کیا۔ مریض گھٹنے جُڑ جانے کی وجہ سے کار میں بیٹھ نہیں سکتا تھا اس لئے ویگن کرائے پر لینا پڑتی تھی۔ جب داخلہ مل گیا تو ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ KNEE لائیں۔ اس طرح یکے بعد دیگرے دونوں گھٹنے بدل دئے جائیں گے۔ اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ جو گھٹنے خریدے جائیں وہ امریکہ سے بنے ہُوئے ہونے چاہیں کیونکہ اُن لوگوں میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ گھٹنے کسی انسان کو لگائے جانے ہیں اور اِن کا تعلّق ایک زندگی سے ہے جبکہ ہندوستانی فرمیں جو گھٹنے بناتی ہیں وہ زیادہ توجّہ اپنے نفع پر مرکوز رکھتی ہیں لیکن اُپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے ایک HIP لانے کے لئے بھی کہا جو مستقل طور پر بیٹھنے کی وجہ سے خراب ہوچکی تھی۔ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ایک HIP اور دو NEES بدل دئے گئے اور مریض اس قابل ہوگیا کہ وہ اپنے کمرے سے رسوئی گھر تک جاسکے۔ چندی گڑھ میں اُن کا صاحب زادہ شری ارون کمار ابرول اور بہو شریمتی مدھو ابرول یکے بعد دیگرے رہتے تھے۔ اور بیمار کا خیال رکھتے تھے۔ اس

اُپریشن کے دو سال بعد دوسری HIP بھی خراب ہو گئی اور اس شدّت کا درد اُٹھا کہ خُدا کی پناہ۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے چار ڈاکٹروں کو بُلایا گیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اِس کا آپریشن کروایا جائے۔ متعلقہ ڈاکٹر بضد تھا کہ آپریشن اُس کے ذاتی کلینک میں ہو تاکہ اُسے ۱۰ روز کا بیڈ کا کرایہ بھی حاصل ہو جو پانچ ہزار روپے بنتا تھا۔ آپ کہیں بھی جائیں ہندوستانی ذہنیت صاف دِکھائی دے گی کہ مریض کو مالی طور پر کس قدر نچوڑا جائے۔ پی جی آئی چندی گڑھ میں مشہور تھا کہ جموں کا سرکاری ہسپتال ایک Dispensary ہے ہسپتال نہیں۔ آخر آپریشن ہسپتال میں ہوا۔ لیکن متعلقہ ڈاکٹر کے مالی فائدہ کو مدِ نظر رکھا گیا۔ وہ آپرشن واقعی Dispensary کا اپریشن تھا۔ اِس کے بعد اور کئی دوسری تکالیف نے مریض کو آ گھیرا۔ لیکن عرشؔ صاحب اور اُن کے بچّوں کی طرف سے کوئی ایسی خدمت نہیں جو سرانجام نہیں دی گئی۔ عرشؔ صاحب کے ایک عزیز کرشن نندہ کرشن ٹھیک ہی کہتے تھے - ''میں نے عرشؔ صاحب سے صرف شاعری ہی نہیں سیکھی بلکہ زندگی کرنا بھی سیکھا ہے۔'' زندگی کی کوئی مشکل بھی ہو عرشؔ صاحب اُس سے گھبراتے نہیں بلکہ جُرات اور ہمّت کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ توفیق اُنہیں قدرت نے عطا کی ہے یہی وجہ ہے کہ اِس عمر میں بھی وہ ہشاش بشاس نظر آتے ہیں۔ اپنی اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے وہ صبح کی سیر کو نہیں نکل سکتے لیکن روزانہ چار کلو میٹر سفر ضرور کرتے ہیں۔

عرشؔ کے قدردانوں کی بھی کمی نہیں جن کی ذات پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

اِس سلسلے میں یہ واقعہ سناتے سُناتے اُن کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ جموں میں ہر سال کی

طرح ''یومِ حسینؓ '' کی تقریب کا اہتمام تھا۔ دہلی سے جناب جعفر اعظم گڈھی نامور شاعر اور دہلی کی ایک اہم شخصیت اور ہماچل کے چیف جسٹس جناب ویاس مصرا بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ تقاریب کا سِلسلہ دوپہر کے بعد شروع ہونا تھا۔ اِس لئے دونوں حضرات صبح ۱۰ بجے عرشؔ صاحب سے ملنے اُن کے گھر پر چلے آئے۔ اُن دِنوں عرشؔ کچّی چھاؤنی اسٹریٹ میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے دونوں حضرات کو کرسیاں پیش کیں وہ دونوں شکستہ حالت میں تھیں۔ کیل لگا کر اُنہیں بیٹھنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ تیسری کُرسی نہیں تھی کہ موصوف خود بیٹھتے۔ وہ فرش پر بیٹھ گئے لیکن نہایت مایوسی کے عالم میں۔ اتنی دیر میں مصرا صاحب نے فرمایا ''ایسا لگتا ہے کہ آپ ہمارے آنے سے خوش نہیں ہوئے'' عرشؔ صاحب نے کہا ''نہیں ایسی بات نہیں۔ میں احساس کمتری میں مُبتلا ہو گیا ہوں۔ جن کرسیوں پر آپ تشریف فرما ہیں کیا یہ اس قابل ہیں! اِس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں'' اتنے میں اُن کی اہلیہ چائے لے کر آئیں۔ مصرا صاحب نے فرمایا ''عرشؔ صاحب آپ کبھی میرے پاس شملہ تشریف لائیں۔ آپ کو ایسا furniture مِلے گا جو آپ نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔'' عرشؔ صاحب کے ایسے چاہنے والے اور قدردان کئی ہیں اُنہیں اُن کی ذات پر فخر ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے عرشؔ صاحب سفر کرنے کے بے حد شوقین ہیں وہ اِس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سفر پیدل کیا جائے۔ اِس میں وہ بڑی راحت محسوس کرتے ہیں ایک بار بھدرواہ میں ریاست کے محکمہ اطلاعات کی طرف سے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جناب طالب ایمن آبادی صاحب اگرچہ اُس مشاعرہ میں شرکت کے لئے راضی نہیں تھے لیکن وہ

عرشؔ صاحب کو انکار نہ کر سکے۔ سفر کے لئے محکمہ کی گاڑی جب ڈوڈہ پُل سے تھوڑی دُور آگے پہنچی تو موسلا دار بارش کا یہ عالم تھا کہ وہاں رُکے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ حسنِ اِتفاق سے وہاں جنگل میں ایک شکستہ مکان تھا اور کئی شاعر تھے۔ کسی نہ کسی طریقہ سے رات بسر ہوگئی صبح جاگے تو دُور دُور تک سڑک کا نام ونشاں نہ تھا۔ سڑک بارش کے پانی میں بہہ گئی تھی۔ ادھر دفتر کی مجبوری۔ وہ رخصت صرف ایک دِن کے لئے لے کر آئے تھے۔ عرشؔ صاحب اور طالبؔ صاحب وہاں سے صُبح ۷ بجے پیدل روانہ ہوکر رات کے ۹ بجے بٹوت پہنچے۔ وہاں سے جموں کے لئے ایک ٹرک مِل گیا۔ جس میں سامان لدا ہوا تھا۔ اُس پر بیٹھ کر رات کے ۱ بجے جموں پہنچے۔ طالبؔ صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ عرشؔ صاحب کے ساتھ کہیں مشاعرہ پڑھنے نہیں جائیں گے اِس کے باوجود اُن کے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں پڑا۔ طالبؔ صاحب اُن کے بہت نزدیک تھے۔ ۱۰ جنوری ۲۰۰۵ء کو رحلت فرما گئے ہیں ۔

عرشؔ صاحب دوستوں سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کے تئیں اپنے فرائض سے بھی آگاہ ہیں اور اُنہیں ادا کرتے ہیں۔ عابد مناوری صاحب اُن کے بہت قریب تھے ۔ عابد کی شاعری اُن کی مرہونِ منّت تھی۔ موصوف بھی اُنہیں اپنا بڑا بھائی تصّور کرتے تھے۔ عابدؔ صاحب کے دادا جان طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔ بستر پر لیٹے لیٹے اُن کی پیٹھ پر زخم (Bed Sour) ہوگئے تھے۔ عرشؔ صاحب کو جب اُن کے انتقال کی خبر ملی تو وہ فوراً وہاں پہنچے اور تمام رسومات میں پیش پیش رہے۔ عرشؔ صاحب شروع ہی سے چلنے میں بہت تیز رفتار ہیں۔ دوڑنے میں بھی یہی

عالم ہے۔ جب وہ کالج پہنچے تو ہاکی کی ٹیم فسٹ الیون میں شامل ہو گئے۔ کبڈی کے بعد اُنہیں ہاکی کھیلنے کا بُہت شوق تھا لیکن بُہت جلد اُنہیں ہاکی کی ٹیم سے نکال دیا گیا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ جب بھی گیند اُن کے ہاتھ میں آتی وہ کسی کو پاس نہ دیتے اور خُود گول تک چلے جاتے۔ یہ بات اصول کے بھی خلاف تھی اور ویسے بھی سب کو نا گوار گزرتی تھی۔ حالانکہ اُن کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے مخالف پارٹی کو گول داغ دیں۔

عرشؔ صاحب جب کچی چھاؤنی محلہ میں مقیم تھے تو ایک دفعہ شہر کے خاکروبوں نے ہفتہ بھر کی ہڑتال کا علان کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ ہڑتال کے دوسرے روز موصوف نے کہیں سے جھاڑو لیا اور جس گلی میں رہتے تھے وہ گلی اور اُس کی نالیاں صاف کر دیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ محلہ داروں نے سلسلہ وار صفائی کا کام شروع کر دیا۔ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ خاکروبوں کی ہڑتال کا کوئی منفی اثر پڑا ہے۔ تین روز کے بعد ہی ہڑتال ختم ہو گئی۔ موصوف ایسے کام کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے جس میں دوسروں کا فائدہ ہو۔

۱۷ استمبر ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ عابدؔ مناوری صاحب فراش تھے۔ وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکے تھے۔ عرشؔ صاحب اور طالبؔ ایمن آبادی صاحب اُن کی مزاج پُرسی کے لئے اُن کے دولت کدے پر گئے۔ عابدؔ صاحب کی حالت غیر تھی۔ اس کے باوجود اُن کے لب پر ان دونوں کا نام تھا۔ واپسی پر عرشؔ صاحب نے طالبؔ صاحب سے کہا کہ عابدؔ صاحب کی موت کی منحوس خبر کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ دو روز کے بعد ۱۹ استمبر کو عرشؔ صاحب کے ساتھ پیارے ہتاش بھی صُبح ۸ بجے کے قریب اُن کے

ہاں پہنچے۔ عابد صاحب فرش پر خاموش پڑے تھے۔ اگر چہ ہتاشؔ صاحب بخار میں مُبتلا تھے۔ ابھی عابد صاحب کے نزدیکی رشتہ دار آ رہے تھے۔ عابدؔ صاحب کے گھر کے افراد کے ساتھ مل کر عرشؔ صاحب نے ابتدائی رسومات ادا کیں۔ اُن کی اپنی طبیعت بے حد غیر تھی۔ عابدؔ صاحب اُنہیں بھائی کی طرح عزیز تھے۔ اور اُن کی ۴۰ سال کی رفاقت تھی۔ بعد میں عابدؔ صاحب کے لڑکوں نے بتایا کہ دُنیا سے رخصت ہونے سے پہلے وہ عرشؔ صاحب کا نام لے لے کر اُنہیں پُکارتے رہے۔ آپ اندازہ کیجئے کی اُن کے دل میں عرشؔ صاحب کے لئے کتنا احترام تھا۔ عرشؔ صاحب بھی کبھی اپنے فرض کی ادائیگی سے گریز نہیں کرتے۔

ایک اور واقعہ سُنیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ عرشؔ صاحب کے دل میں انسان کا کیا مقام ہے اور وہ اسے کیا درجہ دیتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ وہ ذات پات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ موصوف جمّوں سے اپنے نانہال جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یہ نہیں کے برابر تھی اس لئے جمّوں سے جو بس پلانوالہ کے لئے روانہ ہوتی تھی وہ شام ڈھلتے ہی وہاں پہنچتی تھی۔ اتنی سواریاں بس کے اندر نہیں ہوتی تھیں جتنی سواریاں بس کی چھت پر ہوتی تھیں۔ عرشؔ صاحب کے ساتھ ایک بزرگ تشریف رکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے دریافت کیا کہ وہ کہاں جائیں گے۔ عرشؔ صاب نے بتایا کہ وہ اپنے نانہال سیری پلائی جائیں گے اُس بزرگ نے پھر کہا اس صُورت میں اُنہیں رات پلانوالہ بسر کرنا پڑے گی اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کر ڈالا کہ کیا پلانوالہ میں اُن کا کوئی رشتہ

دار ہے۔ عرشؔ صاحب نے منفی میں جواب دیا اور بتایا کہ گرمی کا موسم ہے رات بارہ ایک بجے تک گھومتے رہیں گے اُس کے بعد کسی درخت کے نیچے کُچھ دیر آرام کرنے کے بعد سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ اس پر اُس نیک سیرت بزرگ نے اُنہیں دعوت دی کہ وہ رات اُن کے گھر پر قیام کریں۔ عرشؔ صاحب اُن کے ساتھ چلے گئے۔ وہاں اُن کی بڑی خاطر تواضع کی گئی۔ دیہات کے لوگوں میں اُس وقت بے حد خلوص تھا۔ صُبح جب عرشؔ صاحب تمام ضروریات سے فارغ ہوئے تو ناشتہ آ گیا۔ بے حد پُر تکلّف۔ رُخصت ہونے کے وقت اُس بزرگ نے دریافت کیا" آپ نے کس کے گھر جانا ہے"۔ عرشؔ صاحب کے ننہال بڑے آسودہ حال تھے وہ بڑے گھرانوں میں گنے جاتے تھے اور اُن کی شُہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب اُنہیں پتہ چلا تو وہ بزرگ خاموش سے ہو گئے اور پھر عرشؔ صاحب کو تاکید کرنے لگے کہ وہ اپنے ننہال میں اس بات کا ذکر نہ کریں کہ وہ پلانوالہ میں رات کو کہاں ٹھہرے تھے۔ وہ اس بات سے احساسِ کمتری میں مُبتلا ہو گئے تھے کہ اُن کا تعلّق چھوٹی ذات سے ہے لیکن عرشؔ صاحب نے اُنہیں بتایا کی کوئی انسان چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ وہ بھی میری طرح ہی انسان ہیں۔ انسان جو کام بھی کرتا ہے وہ روزی روٹی کمانے کے لئے کرتا ہے۔ اس سے اُس کی ذات نہیں بن جاتی۔ اس پر اُس بزرگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے آبدیدہ ہو کر کہا "آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہمیں بھی انسان کہا ہے۔ ہمارے لیڈروں نے آج تک ایسا نہیں کہا۔ وہ تو اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھوٹی ذات کا ثابت کرو اور حکومت سے مراعات حاصل کرو جبکہ وہ ہمارے لیڈر بن کر مراعات خُود حاصل کرتے ہیں" اس

کے بعد اُنہوں نے عرشؔ صاحب کو بڑی گرم جوشی کے ساتھ الوداع کیا اور کچھ دُور تک چھوڑنے آئے۔

اِس ذکر کے بغیر عرشؔ صاحب کے بارے میں تحریر کی گئی معلومات ادھوری ہوں گی کہ موصوف اچار ڈالنے میں بھی ماہر ہیں۔ دیکھئے اُن کی زندگی کی خوبیوں میں کتنا تضّاد ہے۔ اُنہوں نے کیا کیا شوق پال لے ہوئے ہیں۔

موصوف سادہ زندگی بسر کرتے ہیں جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ کس کس چیز سے پرہیز کرتے ہیں تو نہایت مختصر الفاظ میں یوں جواب دیا۔ ''بُرائی سے'' اور یہ حقیقت بھی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں۔

موصوف مشاعروں کے بے حد شوقین رہے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی میں اِتنے مشاعرے پڑھے ہیں جن کا کوئی حساب نہیں۔ کسی زمانے میں اُنہیں مشاعروں کا شاعر گردانا جاتا تھا۔ کسی مشاعرہ میں بھی اُن کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔ پھر اُس حالت میں جب وہ تحت اللفظ پڑتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی کامیابی اُن کے کلام کے معیاری ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی اور پھر اُن کی شاعری میں نیا پن بھی تھا۔ اگر اُن کے کلام میں کوئی پُرانا خیال آ بھی جاتا تو وہ اس ادا سے اُسے منظوم کرتے کہ اُس کا اسلوب نیا ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ نیا شعر ہے۔ اُن میں یہ بھی ایک خُوبی رہی ہے کہ اگر کسی ایسے شخص نے مشاعرہ کا اہتمام کیا ہے۔ جو اُن کا دوست ہے یا جان پہچان رکھتا ہے وہ کبھی مشاعرہ میں شرکت سے انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن اب مشاعروں میں کم شریک ہوتے ہیں۔ موصوف غالبؔ،

فراق ، لسان الاعجاز ، پنڈت میلا رام وفاؔ اور نریش کمار شادؔ جیسے شاعروں کے کلام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور اُن کے مدّاح بھی ہیں۔ جب ریاست جمّوں وکشمیر کا ذکر آتا ہے تو وہ جناب اندر جیت لُطفؔ۔ عابدؔ مناوری اور طالبؔ ایمن آبادی کے نام سے آگے نہیں بڑھتے۔ ظاہر ہے ان حضرات کا کلام اُن کے معیار پر پُورا اُترتا ہے اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اعلیٰ اور معیاری شاعری میں ہونی چاہیں۔ یہ تینوں حضرات جس مشاعرہ میں بھی شریک ہوتے تھے جی بھر کر داد حاصل کرتے تھے۔ جناب اندر جیت لُطف اور جناب عابدؔ مناوری صاحب کو عرشؔ صاحب کی صحبت اور رہنمائی بھی حاصل رہی ہے۔ مزید برآں تینوں قدرتی شاعر تھے۔ وہ اِسے اُردو شاعری اور زبان کی بدقسمتی تصور کرتے ہیں کہ یہ تینوں شعرا کرام آج ہم میں نہیں ہیں۔ جن باذوق قارین نے شعرا کے کلام کو سُنا یا پڑھا ہو وہ عرشؔ صاحب سے یقیناً اتفاق کریں گے۔ عرشؔ صاحب کو ایک کمی ضرور کھٹکتی ہے کہ اندر جیت لُطف اور عابد مناوری کی طرح جناب ایمن آبادی کوئی شعری مجموعہ نہیں چھوڑ گئے حالانکہ عرشؔ صاحب اُنہیں بار بار اس کے لئے اُکساتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود ادبی حلقوں میں طالب صاحب کا نام ہے اور اُنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ یہ عرشؔ صاحب کی ذاتی رائے ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان زوال پذیر دَور میں سے گزر رہی ہے اِس صورت میں یہ خیال اور بھی نقصان دہ ہے کہ اُردو زبان مُسلمانوں کی زبان ہے۔ ہمارے برسرِ اقتدار سیاست دانوں کے بیانات کُچھ بھی ہوں لیکن حق بات یہی ہے کہ اسے ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور وہ لوگ جو اس سے جُڑے ہوئے

ہیں اس کی برابر قیمت وصول کر رہے ہیں۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا کوئی صُورت نہیں کہ یہ زبان ایک خوش آئند مُستقبل کی طرف گامزن ہو۔ عرشؔ صاحب کا جس ماحول سے واسطہ ہے وہ اُسی کی صُورتِ حال بیان کریں گے۔ اس وقت بدترین صُورت حال ہے۔ یہاں قدم قدم پر یک رُکنی انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا الگ الگ پرچم ہے (اس کے لئے جھنڈا موزوں لفظ ہے) ان میں سے کسی کو بھی اُردو سے کُچھ بھی لینا دینا نہیں۔ ان کا مقصد اُن اداروں سے فائدہ اُٹھانا ہے جو ادب اور تہذیب کے نام پر قائم ہیں۔ ایسے بیشتر اداروں میں مجموعی طور پر اسی نوعیت کے لوگوں کی بھرتی کی گئی ہے جو نہ تو ادیب ہیں اور نہ ہی مہذّب۔ عرشؔ صاحب اُن لوگوں کا بے حد احترام کرتے ہیں جو اس ماحول میں بھی اُردو کی صحیح خدمت کر رہے ہیں۔ معیاری ادب کی تخلیق میں خُود بھی مصروف ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تحریک دے رہے ہیں لیکن ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بالکل محدود ہے۔ یہ بھی ایک بُہت بڑی حقیقت ہے کہ غیر مُسلم شاعروں اور ادیبوں نے اُردو کی بُہت زیادہ خدمت کی ہے۔ اِس میں پنجاب سَرِ فہرست ہے لیکن سیاست دانوں نے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر اس عظیم زبان کو سرے سے ہی ختم کر دیا ہے اور جن شاعروں اور ادیبوں نے اس زبان کی خدمت کی اور جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اہلِ زبان کی نسبت زبان دانوں نے اس کے لئے بُہت کُچھ کیا ہے اُن میں سے جو زندہ ہیں وہ زبان کے مستقبل کے علاوہ خُود پر بھی ہنس رہے ہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جنہیں کسی صُورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن لوگوں کی ذہنیت قابلِ افسوس ہے جو زبان کو کسی خاص فرقہ کی میراث قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف اُن کے ذاتی اغراض کے لئے

ہے۔ یہاں ادبی تقاریب میں صدارت کے لئے ایسے برسرِ اقتدار لوگوں کو لایا جاتا ہے جو غالبؔ کو ”گالب“ کہتے ہیں لیکن اُن کے حواریوں کی وجہ سے ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ایسے ماحول میں کتنی گھٹن ہوتی ہے اور اُن شاعروں اور ادیبوں کے لئے کام کرنا کتنا مُشکل ہے جن کی زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ لیکن وہ پھر بھی اس شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے ادب زندہ ہے اور اس کی تحریک زندہ ہے۔ لیکن کب تک....؟

عرشؔ صاحب کی اُردو کے تئیں خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں اُردو کے حوالے سے اُنہوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے اور ایسا ادب تخلیق کیا ہے جو دوسروں کے لئے رہنما ہے۔ مُلک کے مختلف حصّوں سے موصول ہونے والے تعریفی خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ اُن کی اُردو خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے نثر میں بھی کافی کام کیا ہے لیکن اُن کا زیادہ کام اُردو شاعری کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اگر اُنہوں نے قطعات کہے تو اُن کا بھی میعار قائم کیا۔ نظمیں کہیں تو ایسی جن سے ادب میں اضافہ ہوا۔ غزل کا ذکر کریں تو اُنہیں آبروئے غزل کہا جاتا ہے۔ اُنہوں نے دوہے کہے جو یقیناً غیر روایتی ہیں اور زندگی کے حقائق کے ترجمان۔ اُنہوں نے دوہوں میں ایسے مسائل پیش کئے جن کی طرف اس سے پہلے کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ مختلف میعاری رسائل میں اُن دوہوں کی اشاعت نے ثابت کردیا کہ یہ بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ عرشؔ صاحب خُود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ”میری شاعری محنت کی شاعری نہیں قُدرتی شاعری

ہے۔ مجھ ایسا ناخواندہ اور سیدھا سادہ شخص کیا شاعری کرے گا" جب ایک ایسا شاعر جس کی شاعری عظیم شاعری تسلیم کی گئی ہے ایسے الفاظ کہتا ہے تو وہ زیادہ بامعنی ہوتے ہیں۔ موصوف اتنا کام کرنے کے باوجود آج بھی اپنے آپ کو طالبِ علم تصوّر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ فن ایسا گہرا سمندر ہے جس کی گہرائی تک پُہنچنا کسی کے بھی بس کا روگ نہیں۔ اس تک پہنچنے کی کوشش کے باوجود یہ گہرائی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن اس سے ایک ادیب کے جذبہ کو اور تحریک ملتی ہے اور اُس پر زندگی کے مختلف اِسرار کُھلتے ہیں۔ موصوف کی نظر سے جب مُختلف رسائل میں کئی تعریفی مضمون گزرے ہیں تو وہ یہی کہتے ہیں "مَن تراحاجی بگوئیم تو مرا ملّا بگو" یہ ایک ذخیرۂ الفاظ ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ہر تعریفی مضمون میں شامل ہوتا ہے۔ ان کی کثرت سے اب معنی کی جاذبیّتِ بھی ختم ہو رہی ہے۔ کوئی شاعر ہو، کوئی ادیب ہو اُسے منفرد اور صاحبِ طرز قرار دیا جاتا ہے جبکہ حقایق اس کے برعکس ہوں۔ یہ وبا اب عام ہے۔ شاعروں کے کلام میں فنی خامیاں عام ہوتی ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ریاست میں بے شمار ایسے شعری اور افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں جو خامیوں سے پُر ہیں۔ اُن میں صحیح زبان استعمال نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ہے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" اب کوئی مجموعہ شائع کرنے کے لئے اخراجات کا ہونا لازمی ہے، معیار کا نہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زبان کو ختم کرنے والے یہ خُودساختہ فنکار بھی ہیں۔ جو کسی نہ کسی فن میں ماہر ہیں اور ایسے مجموعے برسرِ اقتدار سیاست دانوں کی سفارشوں پر سرکاری طور پر خرید کر لئے جاتے ہیں کیونکہ اُنہیں مختلف تقاریب میں صدارت کے مواقع فراہم کئے

جاتے ہیں اور اس طرح اخبار میں اُن کا نام آتا ہے اور تصویر بھی شائع ہو جاتی ہے۔ اُن کے لئے یہی غنیمت ہے اس طرح وہ وقت بھی آئے گا جب سرکاری لائبریریاں غلط ادب کا مرکز بن جائیں گی۔ اور اس ادب سے فیض یاب ہونے والے گمراہ ہو کے رہ جائیں گے۔ اگرچہ عرشؔ صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے اور یہ سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن اِس میں چند ایسے احباب بھی ہیں جو اُن کے بہت قریب ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ اُن کے گھریلو تعلقات رہے ہیں۔ اُن میں حضرت خُمارؔ جالندھری، رمیش کھوسلہ امیدؔ، عابدؔ مناوری، طالبؔ ایمن آبادی، کرنل ہمدمؔ صحرائی کے نام شامل ہیں۔ اُن کے علاوہ جناب مہندر پرتاپ چاندؔ اور ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ وجے دیو ہیں۔ پروفیسر جے۔ آر۔ راٹھورؔ، ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن آچاریہ شری چندر کالج آف میڈیکل سائینس اینڈ ہاسپٹل سدھرا جموں، اُن کے کرم فرماؤں میں ہیں۔ عزیزی راجکمار سلگوترہ نقشؔ، انل سلگوترہ اثرؔ اور خورشیدؔ کاظمی اُن کی زندگی کا ایک حصّہ ہیں۔ ایسے بے شمار شاعر ہیں جو عرش صاحب سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن یہ فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر یہ نام شائع کئے جائیں تو ایک اشتہار کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اِن میں وہ نام بھی ہیں جو گاہے گاہے اُن سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ اس کے باوجود موصوف خُود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خُود ایک طالب علم ہیں۔ وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ایسے بے شمار شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں جن کے مسودات پر اُنہوں نے نظر ثانی بھی کی ہے اور اُن کے دیباچے بھی تحریر کئے

ہیں جو پسند ہی نہیں کیئے گئے بلکہ بیشتر تبصروں میں اُن کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ اُنہوں نے چند مجموعوں پر مضامین بھی سُپردِ قلم کیئے ہیں۔ آپ جب بھی اُنہیں ملنے کے لئے جائیں وہ ادبی کام میں مصروف ملیں گے۔ ملاقات کے وقت کام کو بھول جائیں گے اور گپ شپ میں مصروف ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ کسی قسم کا واقعہ بھی ہو بتانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دہلی سے ایک صاحب یہاں ملازمت کی غرض سے آئے تھے جو بعد میں جمّوں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر بھی رہے۔ عرشؔ صاحب کے ہاں تین ماہ تک مہمان کے طور پر قیام پذیر رہے تھے۔ بعد میں اُنہوں نے اپنی مرضی سے کرایہ پر مکان لیا تھا ورنہ عرشؔ صاحب بضد تھے کہ وہ اُن کے پاس رہیں۔ وہ سمجھیں گے کہ اُن کا چھوٹا بھائی اُن کے پاس رہتا ہے۔ لیکن بعد میں اُنہیں صاحب کا رویّہ عرشؔ صاحب کے بارے میں منفی رہا۔

موصوف میں ایک یہ خوبی بھی ہے کہ جو شخص بھی اُن کے ساتھ محبّت کے ساتھ پیش آتا ہے وہ اُسے کبھی فراموش نہیں کرتے اور اپنی تحریروں میں اُس کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔ عرشؔ صاحب پر جموں یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے ایم۔فل کیا ہے اُس نے اُن کے شعری مجموعہ ''اساس'' پر اپنی تحقیق کی ہے۔ ''اساس'' کی رسمِ اجرا عرشؔ صاحب کے یومِ ولادت ۳ دسمبر ۲۰۰۰ء کو کاروانِ ادب سینیر سٹی زن آف کرنال کے زیرِ اہتمام کی گئی تھی۔ اِس موقعہ پر موصوف کو مومنٹو کے علاوہ ۳۱۰۰ روپے کی رقم بھی پیش کی گئی تھی۔ یہ تمام کاروائی جس میں کُل ہند مشاعرہ بھی شامل تھا، ٹی۔وی۔ کی طرف

سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کٹھیاڑ یونیورسٹی (بہار) کے ایک طالب علم نے اُردو غزل پر ڈاکٹریٹ کی تھی۔ اس سلسلے میں عرشؔ صاحب کا کلام اور حالاتِ زندگی بھی حاصل کیئے گئے تھے۔ اسطرح بستی (گورکھپور) کے ایک پروفیسر اختر بستوی نے ۱۹۶۰ء میں اپنے تھیسز میں عرشؔ صاحب کے کلام کا حوالہ بھی دیا تھا اور اُن کے اشعار شامل کیئے تھے۔ موصوف کا کلام اور حالات زندگی بہت سے تذکروں میں شامل ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ بھی اُن کے کام کا اعتراف ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور فن پر اُردو اور انگریزی کے اخبارات اور جرائد میں کئی مفکرین نے بہت کُچھ لکھا ہے لیکن اُنہیں اپنی عظمت کا قطعاً کوئی احساس نہیں۔ اِس کے علاوہ دور درشن اور اِس کے پرائیوٹ چینلوں کی طرف سے اُن پر چار عدد ڈاکیومنٹری فلمیں بنائی گئی ہیں۔ وہ ادبی تخلیقی کام میں مُصروف رہتے ہیں۔ ریاست کے باہر بیشتر مقامات پر ''ایک شام عرشؔ صہبائی کے نام'' کے تحت کئی تقاریب ہو چکی ہیں جن میں عرشؔ صاحب کو نوازا گیا ہے۔ یہ اُن کے مداحوں اور چاہنے والوں کی محبت ہے جو اُنہیں ایسی تقاریب میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ عوام میں اُن کا کِتنا احترام ہے۔ اُن کے ایک عزیز جناب پی۔ سی۔ وفاؔ ڈاکخانہ میں کام کرتے تھے۔ وہ اپنے اعلیٰ افسر کی نظر میں بہت کھٹکتے تھے۔ ایک روز اُنہیں چپراسی بُلانے آیا کہ بڑے صاحب یاد کرتے ہیں۔ وفاؔ صاحب نے کہا کہ اگر تبدیلی کا کوئی آرڈر ہے تو اُنہیں یہیں دے دیا جائے۔ چپراسی نے اِس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وفاؔ صاحب بڑے صاحب کی

خدمت میں حاضر ہوئے تو خلافِ توقع بڑے صاحب نے چپراسی کو چائے اور بسکٹ لانے کے لئے کہا۔ وفاؔ صاحب حیرت سے دیکھتے رہے۔ چائے پینے کے بعد اُنہوں نے کہا ''وفاؔ صاحب اگر آئندہ کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی ہو تو سیدھے میرے پاس آیئے گا'' اس سے پہلے کہ وفاؔ صاحب اُن کے سلوک میں اس خوشگوار تبدیلی کی وجہ پوچھتے، اُن کے بڑے صاحب خود ہی گویا ہوئے۔ ''کل میں نے آپ کو بازار میں عرشؔ صہبائی صاحب کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ اُنہیں کیسے جانتے ہیں'' وفا صاحب نے بتایا کہ عرشؔ صاحب اُن کے بڑے بھائی کی طرح ہیں'' بڑے صاحب اکثر مشاعروں میں عرشؔ صاحب کا کلام سُنتے تھے اور اُن کے مدّاح تھے۔ یہ واقعہ اتنا چھوٹا ہو کر بھی خُود میں بُہت بڑا ہے۔

جمّوں میں کسی نیم سرکاری ادارے کی طرف سے ایک مقامی موضوعاتی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے سردار جعفری بھی اُس روز یہاں تھے اس لئے اُنہیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مقامی شاعروں میں سب سے بعد میں عرشؔ صہبائی کو اپنی نظم پڑھنے کے لئے دعوت دی گئی لیکن سامعین کا تقاضا تھا کہ وہ غزل پڑھیں۔ عرشؔ صاحب نے سامعین سے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ چونکہ مشاعرہ موضوعاتی ہے اس لئے وہ نظم پڑھیں گے۔ اس پر سردار جعفری نے کہا کہ جب سامعین غزل سُننے کے خواہش مند ہیں تو غزل ہی سُنایئے۔ اس پر ادارے سے متعلق نمائندوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور عرشؔ صاحب سے غزل پڑھنے کو کہا۔ عرشؔ صاحب نے

اچھی خاصی داد وصول کی۔ اس کے بعد مہمان شاعر سردار جعفری صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں۔ موصوف نے کلام پڑھنے سے پیشتر عرشؔ صاحب کی غزل کی تعریف کی اور یہ شعر دوہرایا:۔

سوال یہ ہے کہ دار و رسن کا کیا ہو گا
نہیں ہے اِس سے غرض کوئی بے وفا ہی سہی

اُنہوں نے زوردار الفاظ میں کہا کہ اُنہوں نے اِس موضوع پر ایک طویل نظم کہی ہوئی ہے لیکن اُنہیں اِس کا اعتراف ہے کہ عرشؔ صاحب کا یہ شعر اُس نظم پر بھاری ہے''اِس قسم کے کئی واقعات ہیں جو موصوف کی شاعرانہ عظمت کے آئینہ دار ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے شاعروں کی نظر میں موصوف کا کِتنا احترام ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر میں اُردو کے دسویں نصاب میں عرشؔ صاحب کی دو غزلیں شامل ہیں۔ عرشؔ صاحب کے ایک عزیز جناب کرشن نندہ کرشنؔ نے دیوناگری میں اُن کے ۱۰۰ اشعار پر مشتمل ایک کِتابچہ ''کہکشاں'' کے عنواں سے شائع کیا تھا۔ میں نے حسبِ مقدور عرشؔ صاحب کی ذاتی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مکمّل ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ قارئین حضرات پر چھوڑ دیتا ہوں لیکن مجھے اپنی جگہ یہ اطمینان ہے کہ اس جائزے سے عرشؔ صاحب کی زندگی کے مختلف پہلو واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور انہیں سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر شبیر احمد قاضی شآذ شرقی قصبہ بھدرواہ میں ۸ ؍جون ۱۹۴۹ء کو ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں ڈگری کالج بھدرواہ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرکے اُنہوں نے علیگڑھ مُسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۷۴ء میں ایم۔اے ارضیات (جغرافیہ) کی ڈگری حاصل کی۔ اُردو زبان و ادب میں گہری دِلچسپی کی وجہ سے اُنہوں نے جموں یونی ورسٹی سے ایم۔اے اُردو اور بی ایڈ کیا اور کلکتہ سے ڈی۔بی۔ایم۔ایس کیا۔ اِسی اثنا میں قدیم اور جدید شعرأ اور اُدبأ کے تخلیقی شہ پاروں کا گہرا مطالعہ کیا اور فنِ شاعری کے رموز پر دسترس حاصل کرنے کے علاوہ نثری اور افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ تنقید وغیرہ پر بھی قدرے عبور حاصل کیا۔

پروفیسر شآذ (ہائر ایجوکیشن) میں ۱۶؍ستمبر ۱۹۷۸ء کو بحیثیت لکچرار ارضیات تعینات ہوئے اور ۱۹۸۷ء میں پوسٹ گریجویٹ کالج بھدرواہ میں تبادلہ ہوا' جہاں وہ بحیثیت صدر شعبۂ جغرافیہ اور ڈین سٹوڈنٹس ویلفیر کام کرتے رہے۔ وہ اپنے فرضِ منصبی سے مورخہ ۳۰؍جون ۲۰۰۷ء کو باعزت طور پر سبکدوش ہوئے۔ اپنے پیشے سے متعلق مضمون ''ارضیات'' میں اب تک ایک درجن سے زائد کتابوں کے مُصنّف ہونے کا شرف اُنہیں حاصل ہو چُکا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند اور حوصلہ افزا بات ہے کہ پروفیسر شآذ نے ۲۰۰۰ء میں اپنے اُردو کلام کے حصۂ غزلیات کو ترتیب دے کر ''صدائے دِل'' کے نام سے شائع کیا اور ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کی اور اب اُنہوں نے ریاست کے ایک معروف اور مُستند اُردو شاعر جناب عرشؔ صہبائی ایسے اُستادِ فن کی زندگی اور ادبی خدمات پر ایک مکمل اور جامع کتاب ''عرشؔ صہبائی: شخصیت اور شاعری'' لِکھ کر اپنی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اُن کی شاگردی کا ایک اہم فریضہ ادا کیا۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نِگاہ سے دیکھی جاتی رہے گی۔ خُدا سے دُعا ہے کہ شآذ شرقی کی پوشیدہ ادبی صلاحیتوں کی کلیاں آگے بھی نِکھر کر اپنی خوشبو بکھیرتی رہیں۔

''ایں دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد''

بشیر بھدرواہی

۵- گرین کالونی' بھدرواہ